بچّوں کے لیے
رنگین کہانیاں

رنگین کہانیاں

بچّوں کے لیے

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور کراچی راولپنڈی

بی چونی باہر آؤ

وُہ جُمعے کا دِن تھا۔ اور جُمعے کے جُمعے جمّی کو جیب خرچ ملتا تھا۔ اگر اُس کی سکول کی ہفتہ وار رپورٹ اچھی ہوتی تو اُس کے ابّو اُسے دو رُوپے زیادہ دیتے۔ وہ ہفتہ بھر کوئی شرارت نہ کرتا اور امّی کا ہر کام ہنسی خوشی کرتا تو امّی اُسے دو رُوپے دیتیں۔ اُس کی ایک دادی اماں بھی تھیں، جو اُسے بُہت پیار کرتی تھیں۔ وہ اُسے ہفتے کے ہفتے ایک روپیہ دیتی تھیں۔ اِن پیسوں سے جمّی ہفتہ بھر خود بھی ٹافیاں، بسکٹ اور آئس کریم کھاتا اور اپنے پالتو طوطے کے لیے بھی مکئی کے دانے اور امرود خریدتا تھا۔

تو وُہ جُمعے کا دِن تھا، اور جمّی کے طوطے کے لیے کھانے کو کُچھ نہ تھا۔ تمام دُکانیں بند تھیں۔ مکئی کے دانے ختم ہو گئے تھے اور امرود بھی کوئی نہ تھا۔ جمّی کے گھر سے کُچھ فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ اُس نے سوچا، گاؤں کی کوئی نہ کوئی دُکان ضرور کُھلی ہوگی۔ وہاں سے مکئی مِل جائے گی۔ لیکن گاؤں کے راستے میں ایک جنگل پڑتا تھا۔ اور لوگ کہتے تھے کہ اُس جنگل میں ایک جادوگر رہتا ہے۔ جو آدمی کو مکھی بنا دیتا ہے۔

جمّی نے جادو کی کہانیاں تو بُہت پڑھی تھیں، لیکن کبھی جادوگر کو دیکھا نہیں تھا۔ ویسے بھی اُس کے ابّا جان نے اُسے بتایا تھا کہ بُھوت، چڑیلیں اور جادوگر صرف خیالی باتیں ہیں۔ حقیقت میں اِن کا کوئی وجود نہیں۔ یہ چیزیں کہانیوں ہی میں ملتی ہیں اور اِن کہانیوں کا مقصد محض تفریح اور دِل بہلاوا ہوتا ہے۔

اُس نے پیسے جیب میں ڈالے اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر وہ جنگل تھا جِس کے بارے میں لوگوں کا کہنا تھا کہ اُس میں ایک جادوگر رہتا ہے۔ وہ جنگل میں داخل ہُوا تو اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں کوئی ایسی جھونپڑی نظر آئے جو کسی جادوگر کی معلوم ہوتی ہو۔ لیکن ایسی کوئی جھونپڑی یا مکان نظر نہ آیا۔ وہ بے کھٹکے چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ، گھنے درختوں کے جُھنڈ میں سے، ایک لمبا سا آدمی نِکلا۔ وہ لال اور کالے رنگ کا چوغہ پہنے ہُوئے تھا، اور سر پر لال رنگ کی ٹوپی تھی۔ جمّی ٹِھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سوچا، کہیں یہی تو وہ جادوگر نہیں! یہ سوچ کر وہ اُس لال اور کالے چوغے والے آدمی کے پیچھے دوڑا۔ تھوڑی دُور گیا ہو گا کہ سامنے ایک جھونپڑی دِکھائی دی۔ جُوں ہی چوغے والا لمبا آدمی جھونپڑی کے پاس پہنچا، اُس کا دروازہ آپ ہی آپ کُھل گیا، اور جب وہ آدمی جھونپڑی کے اندر داخل ہو گیا تو آپ ہی آپ بند ہو گیا۔

”لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں“ جمّی نے سوچا ”یہ آدمی جادوگر ہی لگتا ہے“۔

وہ آگے بڑھا اور دروازے پر ہلکے سے دستک دی۔ اندر سے کسی کی چیختی ہُوئی آواز آئی ”بھاگ جاؤ! بھاگ جاؤ! میں کسی سے مِلنا نہیں چاہتا۔ بُہت مصروف ہُوں۔ آ جاتے ہیں، صُبح ہی صُبح، نِکمّے کہیں کے۔ بھاگ جاؤ، ورنہ مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دُوں گا“۔

جمّی بُہت نڈر اور بہادُر لڑکا تھا۔ وہ ڈرا نہیں۔ اُس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا، اور زور سے کہا ”مہربانی فرما کر دروازہ کھولیے۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ تھوڑا پانی دے دیجیے“۔

"اوہو!" اندر سے آواز آئی "یہ تو کوئی بچّہ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ اندر آجاؤ، پیارے بچّے۔ لیکن جُوتے صاف کر کے آنا۔" اِس کے ساتھ ہی دروازہ کُھل گیا۔

جمّی نے گھاس پر جُوتے صاف کیے اور جھونپڑی کے اندر داخل ہوگیا۔ وہی لال اور کالے چوغے والا آدمی آتش دان کے قریب کُرسی پر بیٹھا تھا اور اُس کی بلّی جیسی ہری ہری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جمّی نے گلا صاف کیا اور ہکلاتے ہُوئے بولا "میں نے .... میں نے .... کہا جناب، آپ کی آنکھیں کتنی بڑی ہیں!"

"خاموش!" ہری آنکھوں والا بولا "مجھ سے اِس طرح بات مت کرو جیسے تم ریڈ رائڈنگ ہُڈ ہو اور میں کوئی بھیڑیا ہُوں۔ تم نے اِس سے پہلے کبھی جادُوگر کو نہیں دیکھا ہے؟ ہائے، ہائے، ہائے! مجھے حیرت ہے کہ تمھیں آج کل سکولوں میں کیا پڑھایا جاتا ہے! اچھا، یہ بتاؤ، تم پانی کیوں پینا چاہتے ہو؟ تم پیاسے تو نہیں ہو۔ کہیں میرا بھید معلوم کرنے تو یہاں نہیں آئے ہو؟ اگر ایسا ہے تو میں ابھی تمھیں ...."

"مہربانی کر کے ایک منٹ خاموش ہوجایئے اور میری بات سُنیے" جمّی جلدی سے بولا "میرا نام ...."

"بس بس!" جادُوگر نے اُس کی بات کاٹ کر کہا "تمھیں اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہُوں تمھارا نام جمیل احمد ہے اور تمھارے گھر والے تمھیں پیار سے جمّی کہتے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم بہت عقل مند اور نڈر بچّے ہو، اور شرارتیں بھی کرتے ہو۔ مگر خبردار! میرے ساتھ کوئی شرارت نہ کرنا، ورنہ مکھّی بنادُوں گا۔"

جمّی حیرت سے اُچھل کر بولا "ارے! آپ تو سچ مچ جادُوگر ہیں۔ آپ نے میرا نام بتادیا۔"

"جادُو میرا محبوب مشغلہ ہے" جادُوگر آنکھیں جھپکا کر بولا "میں سارا دن جادُو کے تجربے کرتا رہتا ہُوں۔ میں نے جادُو کی کئی چیزیں بنائی ہیں۔ مثلاً جادُو کا قالین، جس پر بیٹھ کر میں جہاں چاہُوں، جاسکتا ہُوں۔ جادُو کی دیگچی، جو میرے لیے طرح طرح کے کھانے پکاتی ہے۔ اور آج کل میں خُشک پانی بنانے کی کوشش کر رہا ہُوں۔"

جمّی کی ہنسی نکل گئی۔ اُس نے کہا "میرے خیال میں تو یہ کوئی عقل مندی کی بات نہیں، جناب۔ پانی تو گیلا ہوتا ہے۔ اگر وہ گیلا نہیں ہوگا تو پانی نہیں ہوگا۔ پھر بھی، آپ خُشک پانی کیوں بنانا چاہتے ہیں؟"

"سنو!" جادُوگر بولا "تم خشک پانی سے کپڑے دھوؤ گے تو تمھیں اُنھیں الگنی پر لٹکا کر سکھانا نہیں پڑے گا۔ پلیٹیں اور ڈشیں دھوؤ گے تو اُنھیں کپڑے سے خشک کرنا نہیں پڑے گا۔ نہاؤ گے تو جسم کو تولیہ سے پونچھنا نہیں پڑے گا۔ اور ...."

"ایک منٹ، ایک منٹ۔" جمّی نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "مجھے بھی جادُو کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ لیکن بے وقوفی کی نہیں ...."

یہ سُن کر جادُوگر، مارے غصّے کے، تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس نے میز پر سے جادُو کی چھڑی اُٹھائی اور اُسے ہلا کر بولا "تم نے مجھے بے وقوف کہا؟ تمھاری اتنی ہمّت؟ میں تمھیں دریائی گھوڑا بنادُوں گا اور پھر تم زندگی بھر کسی دریا میں پڑے ہاں ہاں کرتے رہو گے۔"

جمّی نے جادُو کی چھڑی اُس کے ہاتھ سے لے لی اور بولا "یہ میری کتنی خواہشیں پُوری کرسکتی ہے؟"

"صرف ایک" جادُوگر نے کہا "اِسے میز پر رکھ دو۔ تم بہت خطرناک لڑکے ہو۔ پھر بھی میں تمھیں پسند کرتا ہُوں۔ مجھے تم جیسے ذہین اور نڈر بچّے اچھے لگتے ہیں۔ تم میرے جادُو کے کرتب دیکھو گے؟"

"جی ہاں۔ بڑی خوشی سے" جمّی چہک کر بولا۔

"بتاؤ، کیا دیکھنا چاہتے ہو؟" جادُوگر نے پُوچھا "لیکن، خدا کے لیے، طُوفان لانے کو نہ کہنا۔ مجھے بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سے ڈر لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہے"، جمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا، "وہ سامنے میز پر چائے دانی رکھی ہے؟ اُس سے کہیے، اُوپر اُٹھے اور چائے اُنڈیلے۔"

جادوگر نے مُنھ ہی مُنھ میں کوئی منتر پڑھا اور پھر چائے دانی کو ہاتھ سے اِشارہ کیا۔ چائے دانی ایک دم ہوا میں اُچھلی اور ساری چائے جمی کے سر پر اُنڈیل دی۔

جمی بالوں کو صاف کرتا ہُوا پیچھے ہٹا اور زور سے بولا "میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ چائے میرے سر پر اُنڈیل دیں۔ معاف کرنا، آپ بہت بے رحم ہیں۔"

"میں بے رحم نہیں ہُوں" جادوگر نے کہا "میں چاہتا تو کھولتی ہُوئی چائے تُمھارے سر پر ڈال سکتا تھا۔ لیکن میں نے اُسے ٹھنڈا کر دیا تھا۔" پھر اُس نے چائے دانی سے کہا "میز پر جاؤ۔ فوراً۔" اور چائے دانی، ہوا میں اُڑتی ہُوئی، میز پر چلی گئی۔

جادوگر نے قہقہہ لگا کر کہا "دیکھا میرا کمال؟ اب بتاؤ، اور کیا دِکھاؤں؟"

جمی نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اُس نے کہا "اِن لکڑیوں کو، جادو کے زور سے، بُجھا دیجیے۔ کمرا بہت گرم ہو گیا ہے۔ اتنی سردی تو نہیں ہے۔"

جادوگر نے مُنھ ہی مُنھ میں کوئی منتر پڑھا اور زور سے بولا "پانی! پانی! آؤ! آگ بُجھاؤ!" ایک دم پانی کا ایک زبردست ریلا آیا اور آتش دان میں گھُس گیا۔ لکڑیاں، جو دھڑ دھڑ جل رہی تھیں، سِسکیاں لے کر بُجھ گئیں۔ کمرے میں دُھواں ہی دُھواں ہو گیا۔ جمی کھانسنے لگا۔

جادوگر ہنس کر بولا "اب تو تُم مان گئے ہو گے کہ میں بہت بڑا جادوگر ہُوں۔"

"آپ جادوگر تو ہیں" جمی نے کہا "لیکن بہت بڑے نہیں۔"

"کیا کہا؟" جادوگر غصّے سے بولا "میں بہت بڑا جادوگر نہیں ہُوں؟ ارے، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اِس سے بھی بڑے کمال دِکھا سکتا ہُوں۔"

"مُجھے بھی ایک جادو کا کرتب آتا ہے" جمی نے کہا "اور میں شرط لگاتا ہُوں کہ ایسا کرتب آپ نہیں دِکھا سکتے۔"

"چلو، دکھاؤ" جادوگر بولا "اگر میں وہ کرتب نہ دِکھا سکا تو میں تمھیں.......... میں تمھیں.........."

"یہ جادو کی چھڑی دے دُوں گا" جمی جلدی سے بولا "یہی کہنا چاہتے تھے نا آپ؟ لیکن کہہ نہ سکے، کیوں کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ وہ کرتب کبھی نہ دِکھا سکیں گے۔"

"مُجھے وہ کرتب دِکھاؤ۔ میں منٹوں میں ویسا ہی کرتب تمھیں دِکھا دُوں گا" جادوگر تن فن ہو کر بولا۔

"ٹھیک ہے" جمی نے کہا "ایک گلاس لائیے۔ ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔ اِسے میز پر رکھ دیجیے۔"

جادوگر نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ میز پر گُلابی رنگ کا میز پوش بچھا ہُوا تھا۔ پھر اُس نے جمی سے پُوچھا "اب کیا چاہیے؟"

"ایک چونّی اور دو اٹھنّیاں" جمی نے کہا "ٹھہریے۔ میں اپنی جیب میں دیکھتا ہُوں۔" یہ کہہ کر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اُس میں سے ایک چونّی اور دو اٹھنّیاں نِکالیں۔ اُس نے چونّی میز پر رکھی اور اُس کے اُوپر اُلٹا گلاس رکھ دیا۔ اب اُس نے ایک اٹھنّی دائیں طرف گلاس کے کنارے کے نیچے رکھی اور دُوسری اٹھنّی بائیں طرف کنارے کے نیچے رکھ دی۔ دونوں اٹھنّیاں آدھی گلاس کے اندر اور آدھی باہر تھیں۔ گلاس کے بیچوں بیچ چونّی پڑی تھی۔

"اب دیکھیے، اور غور سے دیکھیے" جمی نے کہا "چونّی گلاس کے اندر ہے۔ گلاس کے کنارے اٹھنّیوں پر ٹِکے ہُوئے ہیں۔ کیا آپ گلاس یا چونّی کو چھُوئے بغیر چونّی کو باہر نکال سکتے ہیں؟"

جادوگر نے غور سے تینوں سکّوں اور گلاس کو دیکھا اور پھر ٹھوڑی کھجا کر بولا "میں پہاڑ کو مکھّی اور مکھّی کو پہاڑ بنا سکتا ہُوں۔ چونّی کو گلاس کے اندر سے نہیں نکال سکتا۔ ایسا جادو میں نے ابھی نہیں سیکھا ہے۔ پھر بھی کوشش کرتا ہُوں۔"

اُس نے زور زور سے ہاتھ ہلائے اور پھر منتر پڑھ کر گلاس پر پھُونکا۔ گلاس کا رنگ ہرا ہو گیا۔ لیکن چونّی اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ جادوگر نے کہا "یہ منتر کام نہیں کرے گا۔ دُوسرا پڑھتا ہُوں۔" اُس نے پھر کوئی منتر پڑھا اور گلاس پر زور سے پھُونک ماری۔ دونوں اٹھنّیاں کالی ہو گئیں۔ لیکن چونّی اپنی جگہ جمی رہی۔

جادوگر جھلّا کر بولا "وہ کون سا منتر ہے جو تُم چونّی کو نکالنے کے لیے پڑھتے ہو؟"

"وہ منتر یہ ہے: بی چونّی باہر آؤ! باہر آؤ! آ بھی جاؤ!"

"بکواس!" جادوگر بولا "یہ تو کوئی منتر نہیں۔ لیکن خیر، میں پڑھتا ہوں۔" اُس نے گلاس کے اُوپر ہاتھ ہلایا اور زور زور سے کہنے لگا "بی چونّی، باہر آؤ! باہر آؤ! آ بھی جاؤ!" لیکن چونّی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

جمّی نے قہقہہ لگا کر کہا "آپ گلاس اور اٹھنیوں کو اُن کی اصل شکل میں لے آئیے۔ میں چونّی کو باہر نکالتا ہوں۔ بہت آسان ٹرک ہے۔"

جادوگر نے منتر پڑھ کر گلاس پر پھونکا۔ وہ سفید ہو گیا۔ پھر اُس نے دُوسرا منتر پڑھ کر اٹھنیوں پر پھونکا۔ وہ بھی سفید ہو گئیں۔

"شکریہ" جمّی نے کہا "اب میں منتر پڑھتا ہوں۔ اور دیکھیے چونّی کس طرح باہر نکلتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ میز پر جھکا، ایک ہاتھ گلاس کے پاس، میز پر رکھا اور بڑی اُنگلی سے آہستہ آہستہ میز پوش کو کھُرچنا شروع کیا۔ میز پوش کو اُنگلی سے کھُرچتا جاتا اور کہتا جاتا "بی چونّی، باہر آؤ! باہر آؤ! آ بھی جاؤ!" چونّی آہستہ آہستہ جمّی کی طرف کھسکنے لگی، اور آخر کار کھسکتی ہُوئی دونوں اٹھنیوں کے بیچ میں سے باہر نکل آئی۔ جمّی نے نہ تو گلاس کو چھُوا تھا اور نہ کسی سکّے کو۔ وہ صرف اُنگلی سے میز پوش کو کھُرچ رہا تھا۔

"ونڈرفُل!" جادوگر اچھل کر بولا "بہت شان دار! تم نے یہ جادُو کہاں سے سیکھا؟"

"یہ جادُو نہیں، ٹرِک ہے یعنی چکما" جمّی نے کہا "میرے ابّو نے سکھایا تھا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ مجھے پاس کے گاؤں سے مکئی لانی ہے اور پھر گھر جانا ہے۔ امّی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ اِس جادُو کی چھڑی کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"ٹھہرو!" جادُوگر بولا "یہ چھڑی تمھاری صرف ایک خواہش پُوری کر سکتی ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ تم اِس سے اپنی کون سی خواہش پُوری کرنے کو کہو گے۔ ہو سکتا ہے تم اِس سے کہو کہ اِس جادُوگر کو چاند پر بھیج دو۔"

"میں ایسی بے وقُوفی کی باتیں نہیں کرتا" جمّی بولا "بتا دُوں، میں اِس سے کیا چیز مانگوں گا؟"

"ہاں، بتاؤ" جادُوگر نے کہا "تاکہ مجھے اِطمینان ہو جائے کہ تم مجھے کوئی نُقصان نہیں پہنچاؤ گے۔"

"تو سُنیے" جمّی بولا "میں جادُو کی چھڑی سے کہوں گا کہ میری امّی کے لیے ایک اچھّی سی واشنگ مشین لا دے۔ آپ مُسکرا رہے ہیں؟ مُجھے بے وقُوف سمجھ رہے ہیں؟ لیکن میں بے وقوف نہیں ہُوں۔ آپ کو پتا نہیں میری امّی کو میرے اور میرے بہن بھائیوں کے کپڑے دھوتے وقت کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ بہت گندے ہوتے ہیں نا۔ جب اُنھیں واشنگ مشین مِلے گی تو وہ خوشی سے پھُولی نہ سمائیں گی اور اب خدا حافظ، پیارے جادُوگر! آپ کے ساتھ بہت اچھّا وقت گُزرا۔"

"خدا حافِظ!" جادُوگر نے مُسکرا کر کہا "کبھی وقت مِلے تو ضرُور آنا۔ میں تمھیں جادُو کے نئے کرتب دِکھاؤں گا۔"

"ضرُور، ضرُور" جمّی نے کہا "اِس دوران میں آپ چونّی کو نِکالنے کی پریکٹس کرتے رہیں۔ اور ہاں، وہ منتر نہ بھُولیے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے جادُو کی چھڑی بغل میں دبائی، دروازہ کھولا اور باہر نِکل گیا۔

اِس واقعے کو بہت دِن گُزر گئے ہیں، لیکن وہ جادُوگر ابھی تک چونّی کو گلاس میں سے نِکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ اُس کی جھونپڑی کے پاس سے گُزریں گے تو آپ کو اُس کی آواز سُنائی دے گی: بی چونّی، باہر آؤ! باہر آؤ! آ بھی جاؤ!

جادُوگر تو شاید کبھی چونّی کو باہر نہ نِکال سکے۔ لیکن آپ نِکال سکتے ہیں۔ کوشش کیجیے۔ بہت آسان ٹرِک ہے۔ آپ کے دوست دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ (اینڈ بلائٹن۔ ترجمہ: سعید لخت)

پہچان

حنا خیری

اب کی دفعہ جو چھٹیاں ہوئیں تو کاشف کے ابّو اور امّی نے پاکستان جانے کا پروگرام بنایا۔ کاشف کی امّی سوئس تھیں۔ وہ سوئٹزرلینڈ میں ہی پیدا ہوا۔ وہیں پلا بڑھا۔ اُس کا خاندان سوئٹزرلینڈ کے ایک شہر زیورچ میں رہتا تھا۔ اُس نے پاکستان کے تذکرے بارہا اپنے ابّو سے سُنے تھے لیکن ابھی تک پاکستان نہیں گیا تھا۔ اس کے ابّو بھی اتنے سالوں میں صرف دو تین بار ہی گئے تھے۔

کاشف کے ددھیال والے کراچی میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اس کے ایک چچا ان کے پاس کچھ دِن کے لیے زیورچ آئے تھے اور ایک دفعہ اس کی ایک رِشتے کی پھوپھی اور پھوپھا بھی اپنے دو بچوں کے ساتھ ان کے گھر آئے تھے۔ کاشف کو پاکستان سے کچھ خاص دِل چسپی نہیں تھی۔ وہ پاکستان کے بارے میں یہی سمجھتا تھا کہ ایک غریب سا ملک ہے جہاں گندگی، غلاظت اور غربت ہے۔ یہاں کے لوگ پُرانے خیالات کے ہیں اور یہ ملک ترقّی کی راہ میں ابھی بہت پیچھے ہے۔ اب جو ابّو نے پاکستان جانے کا پروگرام بنایا تو کاشف کا مُنھ بن گیا۔

"یہ کیا، ابّو؟ آپ نے تو کہا تھا کہ اب کی چھٹیوں میں امریکا جائیں گے؟"

"ہاں، کہا تو تھا" ابّو بولے "مگر اب میں نے اِرادہ بدل دیا ہے۔ پاکستان گئے بہت دِن ہو گئے ہیں۔ اور پھر تُم بھی تو اب تک اپنے دادا دادی اور دُوسرے رشتے داروں سے نہیں مِلے ہو۔ اُن سے مِل بھی لو گے اور سیر بھی ہو جائے گی۔"

کاشف جب کراچی ایئرپورٹ پر اُترا تو انھیں لینے اس کے چچا اور پھوپھی آئے تھے۔ اُنھوں نے کاشف کو گلے لگا کر خُوب پیار کیا۔ راستے بھر وہ بڑے شوق اور حیرت سے لوگوں کو، سڑکوں کو، گلیوں کو، عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ جدید طرز کی بلند عمارتیں اور بڑے بڑے خُوب صُورت مکان دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔

آخر کار اُن کی منزل آگئی۔ جُوں ہی وہ لوگ مکان کے اندر داخل ہوئے، اُن پر پھولوں کی پتّیاں نچھاور ہونے لگیں۔ کاشف بھونچکا سا کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے! اُن کے اِستقبال کو بہت سارے لوگ کھڑے تھے۔ اس کی بڑی پھوپھی نے اس کے ابّو اور امّی کو ہار پہنائے اور اس سے تقریبًا تین چار سال بڑی اس کی تایا زاد بہن نے اس کے گلے میں ہار ڈالا۔ اُسے یُوں لگ رہا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اُس کے ابّو، دادا ابّا اور دادی امّاں سے گلے مِل کر رو رہے تھے۔ پھوپھیاں، چچیاں اور خاندان کی دُوسری عورتیں اس کی امّی کو گھیرے کھڑی تھیں۔ پھر اُس کی دادی نے اُس کی امّی کو بُلایا اور انھیں اپنے گلے سے لگا کر پیار کیا۔

"ارے! یہ کاشف ہے؟ کتنا بڑا ہو گیا ہے اور کتنا پیارا لگ رہا ہے!" اُس کی دادی امّاں بولیں اور اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کے بعد دادا ابّا نے بھی اُسے پیار کیا۔ تایا ابّا، چھوٹے چچا، بڑی پھوپھی، منجھلی پھوپھی کے عِلاوہ بہت سارے رشتے کے بھائی بہن بھی تھے جنھوں نے اُس کی خُوب آؤ بھگت کی۔

کاشف زندگی کے نئے انوکھے تجربے سے گزر رہا تھا۔ وہ حیرت زدہ سا کھڑا سب کو دیکھے جا رہا تھا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ لوگ اُس کا اِس طرح استقبال کریں گے۔ اس سے اِتنی محبت، پیار اور خلوص سے ملیں گے۔ اُس نے کبھی بزرگوں کو اِتنی محبت سے ملتے، اِتنا پیار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اُن کے چہروں سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ وہ شرمایا سا بیٹھا تھا اور چور نگاہوں سے انھیں دیکھ رہا تھا۔

تین چار دن اسی طرح گزر گئے جیسے تین چار گھنٹے۔ لمحوں کا احساس ہی نہ ہوا۔ سوئٹزرلینڈ میں تو ایک ایک لمحہ ایک ایک پل انسان کو یاد رہتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے۔ مگر یہاں یوں لگ رہا تھا جیسے وقت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ کوئی ابتدا نہیں ہے۔ وقت بہتے دریا کی طرح ایسے گزر رہا تھا کہ ایک مدھم سا دھم بھی سنائی نہ دیتا۔ اُس روز چھوٹے چچا انھیں کراچی کی سیر کرانے لے گئے۔

"دیکھو، بیٹا۔ یہ ہے ہمارے عظیم قائد کا مزار" ابّو نے مزارِ قائد کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا "یہ قائدِ اعظم کی ہمت اور حوصلہ تھا کہ آج پاکستان کا نام دُنیا کے نقشے پر جگ مگا رہا ہے۔ ہم سب آج جو کچھ بھی ہیں، پاکستان کی بدولت ہی ہیں اور پاکستان قائدِ اعظم کی اَن تھک کوششوں اور محنتوں کا صلہ ہے۔" اُنھوں نے عظیم قائد کو اپنا سلام پیش کیا۔ پھر قائدِ ملّت لیاقت علی خان، محترمہ فاطمہ جناح اور سردار عبدالرب نشتر کی قبروں پر حاضری دی۔

جب وہ سمندر پر پہنچے تو کاشف اور اُس کی امّی ششدر رہ گئے۔ کاشف نے تو سمندر صرف فلموں اور تصویروں میں دیکھا تھا۔ ساحلِ سمندر پر آنے کا اُس کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ بلند پہاڑوں کے خوب صورت دیس سوئٹزرلینڈ کا باسی تھا، جو ایک سرد مُلک ہے۔ جہاں سورج مہمانوں کی طرح آتا ہے۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سمندر اس قدر حسین اور اِتنا خوب صورت ہوسکتا ہے۔ اُس نے اپنے ذہن میں سمندر کے متعلق جو تانے بانے بُنے تھے، وہ وہاں پہنچتے ہی کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئے۔ سمندر اس کے خیال، اس کے تصوّر سے کہیں خوب صورت، کہیں انوکھا، دل فریب اور حسین تھا۔ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے پانی کی نیلگوں وسعتیں دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی حسین سپنا دیکھ رہا ہو۔

وہ سمندر کی موجوں کو چھیڑتا، کنارے کنارے ٹہلنے لگا۔ سورج کی کرنیں سمندر کے سینے پر جھلمل جھلمل کرتی اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ وہ اور اُس کی امّی سرد مُلک کے رہنے والے تھے۔ انھیں یہاں کی گرم ہوا نے بڑا متاثر کیا۔ خوب صورت سمندر کی وُسعت نے انھیں دیوانہ سا کر دیا۔ وہ بچّوں کی طرح خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ جو بات اس گہرے نیلگوں سمندر میں تھی، وہ بات بھلا پہاڑوں میں کہاں۔ جب وہ واپس لوٹے تو بے انتہا خوش تھے۔ اگلے روز رات کو اُنھوں نے چاندنی رات میں کشتی میں کیماڑی کی سیر کی اور بہت لُطف اُٹھایا۔

کاشف کی اُردو اب کافی بہتر ہوگئی تھی۔ اِتنے برسوں بعد وہ لوگ آئے تھے۔ سارے خاندان نے اُن کی دعوتیں کیں۔ کبھی فلاں چچا کے ہاں دعوت ہے تو کبھی فلاں پھوپھی کے ہاں۔ ابّو کے پُرانے دوستوں نے بھی ان کی خوب خاطر مدارت کی۔ کاشف کے ابّو کو

اچھا کھانا کھانے کا بہت شوق تھا۔ اُن کے اِس شوق کو دیکھتے ہُوئے اُس کی امّی نے پاکستانی کھانا بنانا سیکھ لیا تھا۔ اِس کے لیے ان کھانوں کا ذائقہ کسی طور بھی نیا نہیں تھا۔ البتہ کُچھ کھانوں سے وہ ناآشنا تھا ــــ اس کے ابّو نے اُسے اور اُس کی امّی کو پاکستان دکھانے اور گُھمانے کا پروگرام بنایا۔

سب سے پہلے وہ موہن جو دڑو پُہنچے۔ اسے دیکھ کر تو کاشف اور اُس کی امّی حیران رہ گئے۔ اُس کے ابّو نے کہا "یہ شہر 2500 سال قبل مسیح آباد تھا۔ یہاں کے لوگوں کا رہن سہن، طرزِ زندگی، مُعاشرت سب کُچھ ہمیں اُن چیزوں سے معلوم ہُوا جو یہاں سے برآمد ہوئی ہیں۔ اچھا خاصا بڑا شہر تھا۔ یہ دیکھو۔ یہ گھر ہیں، جہاں لوگ رہتے ہوں گے۔ یہ جگہ غسل خانے کے طور پر اِستعمال ہوتی ہوگی۔ یہ گلیاں 13 سے 33 فٹ چوڑی ہوں گی۔ مکانات پُختہ اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ بڑے گھروں میں ایک سے زیادہ منزلیں تھیں۔"

"یہ کیا ہے، ابّو؟" کاشف نے ایک طرف اِشارہ کیا۔

"یہ کنواں ہے۔ ہر گھر میں کنواں، غُسل خانہ اور نالیاں ہوتی تھیں۔"

اُنھوں نے وُہ تالاب بھی دیکھا جو ایک بہت بڑا سوئمنگ پول تھا۔ کاشف اور اُس کی امّی یہاں ہر چیز کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

"کیا زبردست تہذیب تھی!" اُس کی امّی نے سر ہلا کے کہا۔ وُہ بہت مُتاثر دکھائی دے رہی تھیں۔ اُنھوں نے ایک ایک چیز بڑے شوق، بڑے اچنبھے سے دیکھی۔ ان کا جی نہیں چاہ رہا تھا وہاں سے جانے کو، لیکن مُسافر کو اپنا سفر جاری رکھنا پڑتا ہے۔

لاہور پُہنچ کر کاشف کا دِل خُوش ہوگیا۔ سب سے پہلے اُنھوں نے بادشاہی مسجد کی سیر کی اور چھتوں اور دیواروں پر کی گئی میناکاری اور نقش و نگار دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ شاہی قلعہ بھی ان کو بہت بھایا۔ خاص طور پر شیش محل دیکھ کر تو ان کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ شالامار باغ اور جناح باغ بھی بہت پسند آئے۔ کاشف جو سوئٹزرلینڈ کے باغوں پر نازاں تھا، یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں بھی اِتنے خوب صُورت باغ ہو سکتے ہیں۔

لاہور کی سیر کے بعد وُہ اسلام آباد پُہنچے تو جدید طرز کا یہ خوب صُورت صاف سُتھرا اور ہرا بھرا شہر کاشف کو بہت پسند آیا۔ وہاں سے وُہ مری گئے اور پھر نتھیا گلی۔ دُور تک پھیلی ہُوئی پہاڑیوں پر چھا سبزہ آنکھوں کو تراوت بخش رہا تھا۔ چیڑ اور صنوبر کے درخت جھُوم جھُوم کر اپنی موجُودگی کا احساس دِلا رہے تھے۔ ہر طرف کھِلے خُوش نما اور خُوش رنگ پھُول بہار دکھا رہے تھے۔ یہاں پُہنچ کے کاشف کو سوئٹزرلینڈ کا "ماؤنٹ پلاٹس" یاد آ گیا جو سات ہزار فٹ بُلند پہاڑ ہے اور جہاں لوگ ایک ڈبے کی بجلی کی ٹرین میں بیٹھ کر پہاڑ پر پُہنچتے ہیں۔ ٹرین بالکُل سیدھی چڑھتی ہے اور نیچے گہرائیوں کی طرف دیکھنے سے خوف محسُوس ہوتا ہے۔

"چلو، اب تمھیں شاہراہِ قراقرم کی سیر کرائی جائے" ابّو نے کہا۔

"وُہ کیا ہے؟" کاشف نے پُوچھا۔

"پہاڑوں کو کاٹ کے پاکستان اور چین کے درمیان ایک سڑک بنائی گئی ہے جو بعض مقامات پر سترہ اٹھارہ ہزار فُٹ بلند ہے۔ اِس کے اِردگِرد اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں جو برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ دُنیا کی دُوسری سب سے اُونچی چوٹی "کے ٹُو" اسی پہاڑی سلسلے میں ہے۔

آخر کار وہ لوگ خوب صورت مناظر سے لطف اٹھاتے ہوئے شاہراہِ قراقرم پہنچ گئے۔ پہاڑ برف کا لبادہ اوڑھے، سینہ تانے کھڑے تھے۔ یہاں کی خوب صورتی دیکھ کر کاشف سوئٹزرلینڈ کو بھول گیا۔ کہنے لگا "میں تو سمجھتا تھا کہ سوئٹزرلینڈ ہی خوب صورت ملک ہے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ پاکستان بھی اتنا حسین ہو سکتا ہے۔"

آخر کار جی بھر کے سیر کر کے، دریاؤں، ندیوں، پہاڑوں کو کھوجتے وہ لوگ واپس کراچی پہنچ گئے۔ اب ان کے جانے میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے تھے۔ سب پھوپھیوں، چچیوں، بھائی بہنوں نے انھیں تحفوں سے لاد دیا تھا۔ کاشف کی امی سندھی گلا، بلوچی لباس، کڑھی ہوئی شال۔ شیشے کے کام کی ٹی کوزی اور اجرک پا کر پھولی نہ سمائیں۔ دادی اماں کی اُن کے جانے کے خیال سے آنکھیں بھر آئیں۔ صرف دو دن بعد ان کی روانگی تھی۔ جب اس کے ابو رات کو کھانے کے بعد کافی پی کر اپنے کمرے میں گئے تو کاشف کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"کیا بات ہے؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"ابو، مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے" کاشف نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم یہیں رہ جائیں؟"

"یہاں رہ جائیں، کیا مطلب؟" ابو حیران رہ گئے۔

"میرا مطلب ہے ہمیشہ کے لیے یہاں آ جائیں" اس نے کہا۔

"مگر یہ تو ایک غریب اور گندہ ملک ہے۔ تمھارے لیے یہاں دل چسپی کی کوئی چیز نہیں" ابو نے اس کے کہے ہوئے الفاظ دُھرا دیے۔

"نہیں، ابو" اُس نے شرمندگی سے کہا "پاکستان بہت اچھا ہے۔ بہت خوبصورت، بہت حسین ہے۔ یہاں سب کچھ ہے، پیار، محبت، خلوص۔"

"بیٹے، میرے بس میں ہوتا تو میں یہاں آ جاتا۔ مگر تمھیں پتا ہے کہ فی الحال یہاں آنا ممکن نہیں۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر کوشش کروں گا کہ ہر سال یہاں آیا کریں۔"

جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو سب لوگ اُداس تھے خاص طور پر دادا ابا اور دادی اماں تو بہت چُپ چُپ اور افسردہ سے تھے۔ کاشف کو بھی نہ جانے کیوں افسوس سا ہو رہا تھا۔ دادا ابا نے جب اُسے گلے لگایا تو اُن کے سینے کی گرمی اُس کے دل میں اترنے لگی۔ دادی اماں نے اُسے گلے لگایا تو اُن کے آنسو نکل آئے۔ باری باری سب نے اسے گلے لگایا اور پیار کیا۔ وہ چُپ چاپ کھڑا تھا۔ اُس کا جی یہاں سے جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

اور جب وہ جہاز کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اُس کا سر فخر سے بلند تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ میرا تعلق پاکستان سے ہے جو ایک غریب ملک ضرور ہے مگر اس کی اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنا تمدن، اپنا کلچر، اپنا ماضی ہے۔ میں پہلے ایک کنویں کے مینڈک کی طرح تھا جو صرف سوئٹزرلینڈ کو ہی سب کچھ سمجھتا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ پاکستان سوئٹزرلینڈ سے کہیں اچھا اور پیارا ہے۔

جہاز کے اندر داخل ہونے سے پہلے اُس نے آخری مرتبہ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں اس سرزمین کے لیے عقیدت، احترام اور محبت تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی ساری محبتیں اسے اور کہاں مل سکیں گی۔

اپنا گھر

عفت گل اعزاز

فرحان بہت پیارا بچہ تھا۔ وہ چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتا۔ اپنی استانیوں کا ادب کرتا اور اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ محبت سے رہتا۔ وہ اپنے بھائی نعمان سے بھی بہت پیار کرتا تھا جو اُس سے چھوٹا تھا۔ شام کے وقت فرحان اور نعمان دونوں بھائی محلّے کے دوسرے بچّوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ رات کو بیٹھ کر وہ سکول کا کام بڑی محنت سے کرتا تھا۔ جس دن کسی ٹیسٹ میں فرحان کو اُس کی اُستانی شاباش یا گُڈ لکھ کر دیتیں اُس روز وہ اپنی کاپی امّی اور ابو کو دکھاتا۔ وہ دونوں خوش ہو کر اسے شاباش دیتے اور اسے مزید محنت کرنے کی تاکید کرتے۔ وہ چاہتا تھا کہ اسی طرح خوب محنت کرے۔ اسکول میں پڑھا ہوا تمام سبق یاد کرے اور بہت زیادہ تعلیم حاصل کرے اور ایک دن لائق آدمی بن کر اپنے والدین اور اپنے وطن کا نام روشن کرے۔

ایک دن فرحان کو اس کے دوست احمر نے اپنی سالگرہ پر دعوت دی۔ فرحان کو ابّو نے ایک تحفہ لا کر دیا اور اُسے ایک رنگین کاغذ میں پیک کیا اُس تحفے کو لے کر فرحان اُبو کے ساتھ اپنے دوست احمر کے گھر پہنچا۔ احمر کا گھر نہایت شاندار تھا۔ بڑے سے گیٹ کے آگے دُور دُور تک پھیلا ہوا سرسبز و شاداب لان نظر آرہا تھا جس میں گھاس سبز مخمل کی طرح بچھی ہوئی تھی بہت سے رنگوں کے پھُول کِھلے ہُوئے تھے۔ کچھ اُونچے اُونچے درخت بھی تھے جو بڑے دیدہ زیب لگ رہے تھے۔ فرحان کے ابّو نے وہیں گیٹ پر کھڑے ہو کر اس سے کہا کہ دو گھنٹے بعد وہ اسے لینے آجائیں گے اس لیے وہ گیٹ پر آ جائے۔ فرحان نے سر ہلا کر کہا کہ وہ پارٹی سے فارغ ہو کر یہاں آجائے گا۔ اُس کے ابو واپس چلے گئے۔ فرحان کو دیکھ کر احمر بھاگا ہوا اس کے پاس آیا اور لپک کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ”یار تم آگئے! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا!“ احمر خوش ہو کر بولا۔

”یار احمر۔ سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ یہ لو ہماری طرف سے تحفہ!“ فرحان نے کہا۔

”اچھا۔ شکریہ۔ آؤ اندر چلیں!“ احمر نے تحفہ ہاتھ میں تھام لیا اور فرحان کو لے کر اندر داخل ہوا۔ اندر بڑے کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر فرحان مزید حیران ہوا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں، غبارے اور طرح طرح کے رنگین کاغذوں کی جھالریں چھت اور دیواروں پر سجی ہُوئی تھیں۔ ایک بڑی سی میز پر تین منزلہ کیک رکھا تھا۔ ساتھ ساتھ بہت سی موم بتّیاں جل رہی تھیں۔ طرح طرح کے پھل، مٹھائیاں، نمکین چیزیں پلیٹوں میں رکھی تھیں۔ بہت سے برتن بھی ترتیب

سے رکھے گئے تھے۔ کمرے میں رنگین پھولوں والا قالین بچھا تھا۔ بڑے بڑے صوفے چاروں طرف لگے تھے چھت پر شاندار فانوس لٹک رہا تھا۔ کمرا روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کمرے میں دو چار مہمان بھی آ چکے تھے اور صوفوں پر بیٹھے تھے۔ احمر نے اپنی امّی سے فرحان کا تعارف کرایا "امّی یہ فرحان ہیں میرے دوست"۔ فرحان کی امّی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ فرحان نے سلام کیا۔ انہوں نے فرحان کے سلام کا جواب دیا۔ اس کی مزاج پرسی کی۔

"امّی۔ یہ ہماری کلاس کا سب سے زیادہ ذہین بچہ ہے۔ ہمیشہ فرسٹ آتا ہے!" احمر نے فخر سے کہا "واہ! یہ تو بڑی اچھی بات ہے اگر فرسٹ آتا ہے تو محنت بھی تو کرتا ہوگا نا۔ تم بھی دل لگا کر پڑھا کرو" امّی نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا آؤ یار باہر چلیں" احمر نے کہا۔ دونوں دوست کمرے سے باہر آ گئے تھوڑی دیر میں احمر کے اور بھی بہت سے دوست وہاں پہنچ گئے سب لوگ مل کر باتیں کرنے لگے ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ احمر نے فرحان کو اپنے گھر کی سیر کرائی۔ فرحان اُس کا گھر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ احمر کے گھر میں آٹھ دس بڑے بڑے کمرے تھے۔ ہر کمرے میں قالین صوفے، پنکھے، ایئرکنڈیشنر اور ڈھیر سارا ساز و سامان تھا۔ طرح طرح کی آرائشی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ احمر نے شام ہوتے ہی سالگرہ کا کیک کاٹا۔ مہمانوں نے مل کر سالگرہ مبارک کا گیت گایا۔ احمر کی بہنوں نے "مُبارک تمہیں خوشی کا یہ سماں" سنایا۔ سب لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔ اس کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ چلا۔ احمر نے فرحان کو چیزیں نکال نکال کر پلیٹ میں ڈال کر دیں۔ فرحان اس محفل میں بہت خوش تھا۔ دعوت سے فارغ ہو کر سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھ گئے اور گپ شپ کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد احمر کے نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ باہر فرحان کے ابو آ گئے ہیں۔ وہ فرحان کو بلا رہے ہیں۔ اِس خوبصورت کمرے میں، اتنے اچھے ماحول میں، جہاں ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ لطیفے سنائے جا رہے تھے، قہقہے لگ رہے تھے، فرحان کا اٹھنے کو جی نہ چاہا مگر ابّو آ چکے تھے۔ گھر واپس تو جانا ہی تھا۔ اس لیے فرحان نے احمر سے اجازت لی۔ احمر اس کے ساتھ گیٹ تک آیا۔ اس نے فرحان کے ابّو سے کہا کہ وہ بھی اندر آجائیں اور کچھ دیر بیٹھیں مگر انہوں نے انکار کر دیا فرحان نے احمر کو خدا حافظ کہا اور ابّو کے ساتھ گھر چل دیا۔

اپنے گھر کے چھوٹے سے دروازے پر اس نے دستک دی تو امّی نے

دروازہ کھولا۔ اس کے گھر کے چھوٹے سے صحن میں ایک مدھم سی روشنی کا بلب چمک رہا تھا۔ فرحان نے بلب کی طرف دیکھا اور کہا "اس بلب کی روشنی اتنی کم کیوں ہے؟"

بیٹا۔ جتنی طاقت کا بلب ہوگا اتنی ہی روشنی دے گا۔ یہ ہلکی طاقت کا بلب ہے صرف بیس واٹ کا۔"

احمر کے گھر میں جگمگاتے ہوئے فانوس اور بڑی بڑی ٹیوب لائٹیں جن سے سفید دودھیا روشنی نکلتی تھی اس کی آنکھوں میں اُتر آئیں۔ وہ کچھ اُداس سا ہوگیا۔ کمرے میں گیا تو وہاں دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ ایک پرانی سی میز رکھی تھی۔ چار کرسیاں دیوار کے ساتھ لگی تھیں۔ نہ فرش پر قالین تھا۔ نہ بڑے بڑے صوفے تھے۔ یہاں تک کہ بجلی کا پنکھا تک نہ تھا! فرحان کا دل دُکھ کے رہ گیا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے۔ کسی کے گھر میں اتنا قیمتی ساز و سامان، عالی شان فرنیچر۔ یہ شان و شوکت۔ اور کہیں یہ عالم ہے کہ دو کمروں اور تنگ صحن کا یہ چھوٹا سا مکان۔ اللہ میاں! ایسا کیوں ہے؟ ہمارے پاس احمر کی طرح کا گھر کیوں نہیں ہے؟ کیوں۔ آخر کیوں؟ رات کو دیر تک ایسے ہی خیالات اُس کے دماغ میں چکر کھاتے رہے اور وہ بڑا اداس اور غمزدہ ہوگیا۔ نیند آئی تب بھی اُس کے خوابوں میں وہ شاندار مکان اور قالین اور فانوس چھائے ہوئے

تھے اور وہ اس مکان کے بڑے بڑے کمروں میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ صبح سو کر اٹھا تو کچھ دیر کے لیے ذہن سے وہ خیالات نکل چکے تھے۔ ناشتا کر کے وہ تیار ہوا اور بستہ اُٹھا کے اسکول چل پڑا۔ مگر اب پھر اس کے ذہن میں وہی عالی شان کوٹھی تھی۔ وہ ذہنی طور پر پریشان ہو گیا۔ آج املا ہوا تو اس میں کئی غلطیاں ہو گئیں۔ اُستانی صاحبہ نے اسے ڈانٹا۔ وہ اور بھی گڑبڑا گیا۔ گھر آیا تو امّی نے کہا منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔ وہ کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ امّی نے اُسے چُپ چُپ دیکھا تو پوچھا "کیا بات ہے فرحان؟ تم کیوں چپ چپ سے ہو آج؟"

"امّی۔ مجھے یہ گھر اچھّا نہیں لگتا!" فرحان نے کہا۔ امّی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ "پھر کون سا گھر اچھّا لگتا ہے؟"

"احمر کا گھر۔ اس کے گھر میں اتنے سارے کمرے ہیں اور خوب تیز روشنیوں والی ٹیوب لائٹیں ہیں۔ اس کے گھر کے آگے اتنا بڑا باغ ہے ہر کمرے میں قالین اور صوفے ہیں۔ ہمارے گھر میں کیا ہے؟ ایک بھی صوفہ نہیں۔ نہ کوئی فانوس!۔ میں اس چھوٹے اور فضول گھر میں نہیں رہنا چاہتا۔ آپ لوگ کسی اچھّے اور بڑے گھر میں کیوں نہیں رہتے؟" فرحان نے کہا۔

"اچھّا بیٹے۔ اگر تمہیں احمر کا گھر پسند ہے تو تم وہاں جا کر رہنے لگو۔ دیر کس بات کی؟" امّی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"سچ؟ کیا میں وہاں جا سکتا ہوں؟" فرحان نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں ضرور۔ فرحان کی امّی اُسے احمر کے گھر کے دروازے تک چھوڑ آئیں۔ فرحان خوش خوش اندر داخل ہُوا۔ احمر نے اسے دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ فرحان کے دل میں خوشی سے لڈّو پھوٹ رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ خوش تھا۔ شام تک وہ احمر کے ساتھ کھیلتا رہا۔ پھر رات کو اُس نے رنگین ٹی وی پر ڈراما دیکھا۔ نرم نرم قالین پر چلتے ہوئے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ رات کو بڑی ڈائننگ ٹیبل پر سب لوگوں نے کھانا کھایا۔ فرحان سے خوشی کے مارے کھانا بھی ڈھنگ سے نہ کھایا گیا۔

"تمہارے ابّو تمہیں لینے نہیں آئے"؟ فرحان سے احمر نے پوچھا۔

"نہیں تو" فرحان نے جواب دیا "میں تمہارے کمرے میں سوؤں گا۔ ٹھیک ہے"۔ رات کو دونوں دوست دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اگلا دن چھٹی کا تھا۔ گھر کے سب لوگ دس بجے تک پڑے سوتے رہے جب کہ فرحان صبح سویرے اُٹھنے کا عادی تھا۔ وہ جلدی اُٹھ کر باغ میں چلا گیا۔ رنگ برنگے پھول دیکھ کر اُس نے ایک پھول توڑ لیا۔ مالی بھاگا ہوا آیا اور اُسے ڈانٹنے لگا "اے لڑکے! تم نے پھول کیوں توڑا ہے"؟

"توڑا ہے۔ میری مرضی" فرحان نے جواب دیا۔

خبردار۔ پھول کو ہاتھ مت لگانا! چلو ادھر سے ہٹو۔ یہاں پودوں کے اوپر مت چلو۔ ٹوٹ جائیں گے!"

فرحان کو اُس کا یُوں ڈانٹنا اچھّا نہیں لگا۔ وہ دوسری طرف جا کر بیٹھ گیا۔ اسے اب بھُوک لگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ناشتا کرے مگر گھر میں تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اپنے گھر میں تو وہ بے دھڑک باورچی خانے میں چلا جاتا تھا اور جو چاہتا کھا پی سکتا تھا۔ مگر یہاں تو اسے معلوم بھی نہ تھا کہ باورچی خانہ کہاں ہے۔ وہ بیکار سا کبھی ادھر گھومتا رہا۔ کبھی اُدھر نکل گیا۔ مگر گھر کے لوگ اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔ وہ احمر کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اب جاگو صبح ہو گئی ہے تو اُس نے غصّے سے کہا "میری نیند خراب نہ کرو۔ تم بھی لیٹ کر سو جاؤ!" فرحان چپ بیٹھا رہ گیا۔ وہ میز پر پڑی کتابیں پڑھنے لگا مگر کتابوں میں بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔ بھُوک سے بُرا حال تھا۔ اُسے اس بڑے گھر کے طور طریقوں پر سخت غصّہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہتے لگا کہ اپنے گھر لوٹ جائے۔ مگر وہ گھر چھوٹا تھا۔ گندہ بھی تھا۔ وہاں وہ نہیں جانا چاہتا تھا۔

کافی دیر بعد سب لوگ اٹھے تو ناشتا تیار ہوا اور فرحان نے بھی سب

کے ساتھ ناشتا کیا۔ فرحان کی امی کو آج کہیں پارٹی پر جانا تھا۔ وہ اپنے بالوں میں رولرز لگائے بیٹھی تھیں اور عجیب سی لگ رہی تھیں اور اخبار ان کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے احمر کو بلا کر اس سے کچھ باتیں کیں۔ فرحان کا جی چاہا کہ اُس کی امی اُس سے بھی پیاری پیاری باتیں کریں۔ اس کے ساتھ ہنسیں مگر انہوں نے فرحان کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ فرحان مایوس ہو گیا اس کی امّی تو اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ کھانا کھاتے وقت بھی اس کی خاطر مُدارات کرتی تھیں۔ بڑی نرمی سے بڑی محبت سے بولتی تھیں اُس کے ساتھ۔ مگر یہ فرحان کی امی نہ تھیں۔ یہ احمر کی امی تھیں۔ فرحان نے سوچا کہ اپنی ماں ہی اچھی ہوتی ہے۔ لیکن خیر۔ اگر یہاں اس کی امی نہ تھیں تو کوئی بات نہیں۔ گھر تو اتنا اچھا تھا۔ اتنا خوبصورت تھا۔ اتنا قیمتی سامان تھا اس گھر میں۔ ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ احمر اُن کے پاس سے اُٹھ کر آیا اور کہنے لگا "فرحان۔ یار آج شام کو ہمیں پارٹی میں جانا ہے"

"میں بھی چلوں گا" فرحان نے خوش ہو کر کہا۔

"نہیں یار! وہاں کوئی بھی تم سے واقف نہیں ہے۔ تم وہاں جا کر بور ہو گے" احمر نے کہا۔

"اچھّا! ٹھیک ہے"! فرحان نے کہا۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے وہ احمر کے رشتے داروں سے ناواقف تھا۔ اجنبیوں کی محفل میں جا کر کرتا بھی کیا تھا

شام کو احمر اُس کی بہنیں اور والدین سب لوگ تیار ہو کے بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیے۔ فرحان کھڑکی سے انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں سناٹا چھا گیا۔ فرحان کو خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں گیا۔ وہ کمرہ بھی خالی تھا۔ البتہ وہاں کارنس پر رکھے ایک سیاہ رنگ کے حبشی کے بُت پر نظر پڑی تو وہ اور بھی خوفزدہ ہو گیا۔ اسے لگا کہ بُت ابھی قریب آ کر اس کی گردن پکڑے گا۔ وہ ڈر کے باہر بھاگا۔ خالی گھر سے اسے بہت خوف لگ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہاں سے دوڑتا ہوا باہر نکل جائے۔ اپنے گھر سے تو انسان مانوس ہوتا ہے۔ مگر یہ عالی شان کوٹھی، یہ ساز و سامان سب کچھ اس کے لیے اجنبی تھے۔ اس گھر کی کوئی بھی چیز اس کی اپنی نہ تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ یہاں نہ اس کی ماں تھی نہ باپ تھا۔ نہ بھائی تھا۔ یہ در و دیوار احمر کے تھے۔ اس کے اپنے نہ تھے۔ پھر وہ یہاں کیوں آیا؟ وہ سوچنے لگا۔ اسے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ کتنی آزادی ہوتی ہے اپنے گھر میں۔ جب جی چاہے سو جاؤ۔ جب جی چاہے اُٹھ جاؤ۔ اپنی ماں ہوتی ہے۔ ہمیشہ پیار کرنے والی ماں۔ اچھے سے ابّو۔ میرا پیارا بھائی نعمان!

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اچانک نوکر نے کمرے میں قدم رکھا۔ "فرحان۔ تمہارے ابّو آئے ہیں"! فرحان پھرتی سے اٹھا اور گیٹ پر جا پہنچا۔ ابو کے ساتھ وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ وہ اچھی طرح یہ بات سمجھ چکا تھا کہ اپنا گھر اپنا ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرے کا گھر، پرایا ہوتا ہے۔ گھر آیا تو اُسے بہت خوشی محسوس ہوئی۔ اُس نے اپنائیت کے جذبے سے سرشار ہو کر تنگ صحن اور مدھم روشنی والے بلب کو دیکھا۔ اسے لگا کہ یہاں ہر چیز اس کی اپنی تھی۔ جیسی بھی تھی، اس کی اپنی تھی۔ اس کی امیّ نے پوچھا "تم آ گئے فرحان"؟

"جی امیّ۔ اپنے گھر کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اپنے گھر میں انسان آزاد ہوتا ہے"!

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ امیّ نے مسکرا کر کہا۔ وہ جان چکی تھیں کہ فرحان کو اپنے اور پرائے گھر کا فرق معلوم ہو گیا ہے۔

بُلبُل کا بچّہ

نوید ہ دُرّانی

"آنٹی ، آنٹی، ہم نے بُلبُل کا بچّہ پکڑا" چھوٹو کرکٹ کا بلّا کونے میں پھینک کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"کہاں ہے ؟" میں نے پُوچھا۔

"شان بھائی کے ہاتھ میں ۔ وہ مُجھے نہیں دیتے"۔

میں نے ہنستے ہوئے اُسے گود میں اُٹھالیا اور بولی "چلیے چھوٹُو جی، ہم آپ کو لے دیتے ہیں"۔

"سچّی" ؟ اُس نے خوشی سے تالی بجا کر کہا۔

"بالکُل سچی مُچی ۔ بھلا آنٹی نے کبھی جُھوٹ بولا ہے ؟"

یہ کہہ کر میں نے لان میں جھانک کر دیکھا ۔ شان ، عاصِم ، رابِعہ اور انیل چاروں ایک دُوسرے پر جھپٹ رہے تھے ۔ میں چھوٹُو کو گود میں اُٹھائے اُن کے پاس گئی ۔

"کیا ہو رہا ہے ، بھئی؟ کیوں ہنگامہ کر رہے ہو"؟ میں نے اُنہیں گھور کر دیکھا تو چاروں خاموش ہو کر ایک دُوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔

"آنٹی ، وہ رہا بُلبُل کا بچّہ" چھوٹُو نے شان کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بُلبُل کے بچّے کی طرف اِشارہ کیا ۔

"آنٹی ، یہ میرا ہے ۔ میں نے پکڑا ہے" شان بُلبُل کے بچّے کو پیٹھ کے پیچھے چُھپاتے ہوئے بولا۔

"نہیں ، آنٹی ۔ اِسے میں نے دیکھا تھا۔ لان میں درخت کے نیچے گِرا پڑا تھا ۔ میں نے ہی سب کو بتایا" ذرا سی رابِعہ نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا "اب شان ہمیں بچّے کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا"۔

میں نے شان کو اِشارے سے پاس بُلایا، اُس نے بُلبُل کا بچّہ مضبُوطی سے پکڑ رکھا تھا ، جیسے اُسے خطرہ ہو کہ اگر گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو کوئی دوسرا چھین لے گا۔

"جس طرح تُم نے اِس بچّے کو پکڑ رکھا ہے ، جانتے ہو اِس کا نتیجہ کیا ہو گا؟" میں نے شان سے پُوچھا۔

"کیا ہو گا' آنٹی ؟" چاروں نے ایک ساتھ کہا ۔

"بچّہ دم گُھٹ کر مر جائے گا" میں نے بتایا۔

"اچّھا!" شان نے فوراً مُٹّھی کھول دی ۔

"لاؤ ، اِسے مجھے دے دو" میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا ۔

"نہیں" اُس نے دوبارہ اپنا ہاتھ پیٹھ کے پیچھے چُھپا لیا "میں جانتا ہوں ، چھوٹُو کو دینے کے لئے مانگ رہی ہیں"۔

"بالکل نہیں ۔ اچّھا ، تُم سب میرے ساتھ آؤ۔"

'آنٹی، ہم اب گھر جائیں گے ۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے ۔ شام کو آکر بُلبُل کے بچّے کے ساتھ کھیلیں گے" رابعہ نے اپنے بھائی عاصِم کی طرف دیکھ کر کہا ، اور وہ دونوں بھاگتے ہُوئے اپنے گیٹ کی طرف لپکے ۔

"چلو بھئی ، ہم بھی اندر چلتے ہیں" میں نے شان سے کہا۔

سامنے برآمدے میں لکڑی کے ایک چھوٹے سے پِنجرے پر میری نظر پڑی تو میں نے اِشارے سے شان کو پاس بُلایا "دیکھو

شان ، میری بات غور سے سُنو ۔ یہ بچہ اُڑ نہیں سکتا ۔ خُود کھا پی نہیں سکتا ۔ اگر یہ بُھوکا پیاسا مر گیا یا اِسے بلّی لے گئی تو اِس کی موت کے ذمّے دار تم ہو گے"۔

"تو میں کیا کروں ؟" اُس نے پُوچھا ۔

"تم یوں کرو کہ اِسے پنجرے میں بند کر دو ۔ جب اِس کے ماں باپ اپنے گھونسلے میں آئیں گے اور بچّے کو غائب پائیں گے تو وہ اِسے تلاش کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ یہاں تک ضرور آئیں گے" ۔

"ٹھیک ہے" شان پنجرے کی طرف سر ہلاتا ہُوا بڑھا ، لیکن پھر ایک دم ٹھٹک گیا "اوہ! یہ تو ٹُوٹا ہُوا ہے!"

"ٹوٹا ہُوا نہیں ہے" میں نے کہا "اِس کا دروازہ غائب ہے ۔ اسے دیوار سے لگا کر رکھ دو ۔ پھر یہ محفُوظ ہو جائے گا"۔

شان نے بُلبُل کے بچّے کو پنجرے میں چھوڑا اور اُس کا دروازہ دیوار سے لگا دیا ۔ میں جانے کے لیے مُڑی تو چُھوٹو میاں نے میرا دامن پکڑ لیا "آنٹی ، آنٹی ، میں بچّے کے ساتھ کھیلوں گا"۔

"ابھی نہیں ۔ سہ پہر کو کھیلیں گے ۔ جب عاصم اور رابعہ آجائیں تو مجھے بُلا لینا" میں نے اپنے کمرے کی جانب جاتے ہُوئے کہا۔

سہ پہر کو بچّوں کا شور کانوں میں پڑا تو میں باہر نکلی ۔ سارے بچّے پنجرے کے گِرد جمع تھے ۔ "یہ کیا ہو رہا ہے ، بھئی ؟" میں نے پُوچھا۔

"آنٹی ، شان ہمیں بچّے سے کھیلنے نہیں دیتا" عاصم نے چلّا کر کہا ۔

"وُہی صُبح والی تکرار ۔ شان، بچّے کو پنجرے سے باہر نکالو اور لان میں آؤ"۔ شان نے لپک کر بچّے کو پنجرے سے نکالا اور دُوسرے بچّوں کے ساتھ لان میں آ گیا ۔

"وہ دیکھو" میں نے سامنے والی دیوار کی طرف اِشارہ کیا "کچھ دکھائی دیا ؟"

"جی ، آنٹی" سب ایک ساتھ بولے ۔

"کیا؟" میں نے پُوچھا۔

"بُلبُل" بچّوں نے جواب دیا ۔

"جانتے ہو یہ کون ہے؟"

"آپ بتائیں"۔

"اِس بچّے کی امّی ۔ اپنے بچّے کو تلاش کر رہی ہے"۔

"اب کیا ہو گا ، آنٹی ؟" شان نے پُوچھا ۔

"ہونا کیا ہے ۔ بچّے کو چھوڑ دو ۔ وہ اِسے چوگا دے گی"۔

"چوگا کیا؟" عاصم نے پُوچھا۔

"دانہ ۔ وہ اِسے اپنی چونچ سے دانہ کھلائے گی" میں نے کہا۔

شان نے جلدی سے بچّے کو چھوڑ دیا ۔ وہ ننھے مُنّے پیروں سے اُچھلتا ہُوا آگے چلا گیا ۔ سارے بچّے گُم صُم اُس طرف دیکھ رہے تھے جدھر بچّہ گیا تھا ۔ اتنے میں سب نے دیکھا کہ بُلبُل اُڑ کر نیچے آئی اور بچّے کو دیکھ کر پھر اُڑ گئی ۔

"بُلبُل اُڑ گئی ! بُلبُل اُڑ گئی!" بچّوں نے شور مچا دیا۔

"خاموش رہو" میں نے کہا "وہ دوبارہ آئے گی"۔

بچّے خاموش ہو گئے ۔ چند منٹ بعد بُلبُل اُڑتی ہوئی آئی اور اپنی چونچ بچّے کی چونچ میں ڈالی ۔ اُس کی چونچ میں دانہ دُنکا تھا جو بچّے کی چونچ میں پہنچ گیا ۔ بُلبُل دوبارہ اُڑ گئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر واپس آئی اور بچّے کو چوگا دیا ۔ تمام بچّے حیرت اور شوق سے، منظر میں جاتے ۔ یہ تماشا دیکھ رہے تھے ۔ میں ذرا دیر کے لیے اُن کے درمیان سے نکل گئی ۔ بچّے تماشے میں اِس قدر محو تھے کہ اُنہیں میرے جانے اور واپس آنے کا پتا ہی نہ چلا۔

"کیوں بھئی ، کیا ہُوا؟" میں نے پُوچھا ۔
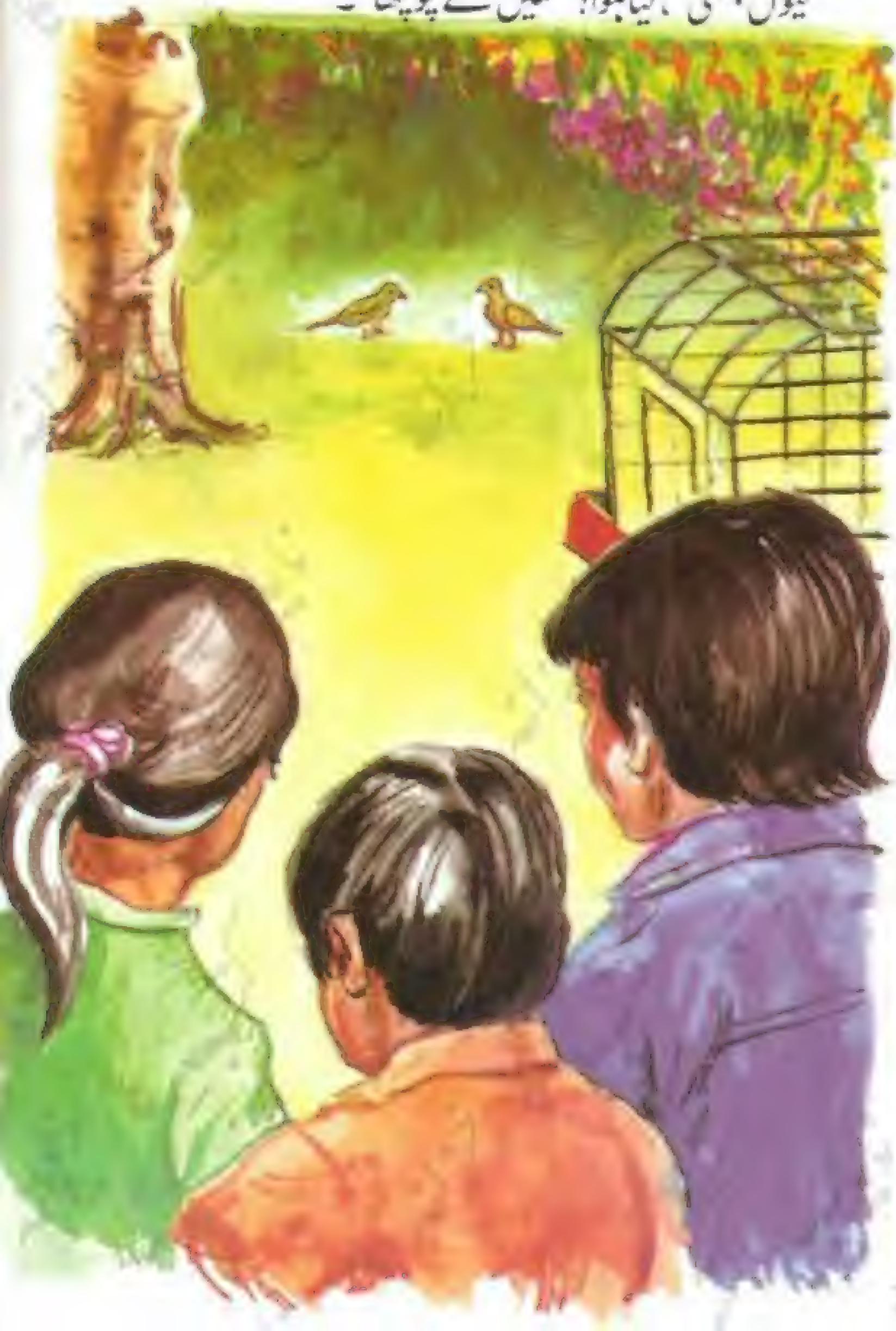
"آنٹی بُلبُل دس مرتبہ آچکی ہے" شان نے بتایا۔

"بس ، اب بچّے کا پیٹ بھر گیا ہو گا" میں نے کہا "چلو شان ، اِسے پنجرے میں بند کر دو ۔ مغرب کے وقت پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے جاتے ہیں" ۔

"تو کیا بُلبُل اپنے بچّے کو یہیں ہمارے پاس چھوڑ جائے گی؟" انیل نے پُوچھا ۔

"بالکل ۔ یہ اُس کی مجبوری ہے" میں نے کہا ۔

"مجبوری؟ مجبُوری کیسی؟" شان نے پُوچھا۔

"بھئی، دیکھونا ۔ اُس کا بچّہ خُود اُڑ نہیں سکتا ، اور وہ اُسے اُٹھا کر لے جا سکتی نہیں ۔ اِس لیے جب تک یہ بچّہ خُود اُڑنے کے قابِل نہیں ہو جاتا ، یہ ہمارے پاس ہی رہے گا ، اور ہمیں اِس کی حفاظت کرنا ہوگی" ۔

شان نے بچّے کو اُٹھا کر پنجرے میں بند کر دیا ۔ عاصِم اور رابعہ اُچھلتے کُودتے اپنے گھر چلے گئے اور چھوٹُو نے دُودھ کے لیے شور مچا دیا ۔

دُوسرے دِن شان نے صُبح سویرے ہی مُجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ "آنٹی ، آنٹی، جلدی اُٹھیے" ۔

کیا ہوا ، بھئی؟" میں آنکھیں ملتی ہُوئی اُٹھ بیٹھی ۔ ابھی ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اور شان روزانہ کی نسبت آج جلدی جاگ گیا تھا۔

"آنٹی ، بُلبُل کا بچّہ پِنجرے میں نہیں ہے!" اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میں ایک دم چھلانگ مار کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے بر آمدے کی طرف بھاگی ، جہاں بُلبُل کے بچّے کا پِنجرا رکھا تھا ۔ پِنجرا خالی تھا! میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو دیوار کے پاس چند پَر دِکھائی دِیے ۔ میں نے دھڑکتے دِل کے ساتھ اُنہیں غور سے دیکھا ۔ وہ بُلبُل کے بچّے کے پَر تھے ۔ میری گردن جُھک گئی ۔

"کیا ہوا ، آنٹی؟" انیل پاس آکر بولا ۔

"بچّے کو بِلّی لے گئی"! شان نے سِسکیاں لے کر کہا ۔

"کوئی بات نہیں ۔ شاید اللہ کی یہی مرضی ہو" میں نے اُسے دلاسا دیا ۔

"مگر آنٹی" شان بولا "مُجھے یُوں لگتا ہے کہ ہم نے اُس کی حِفاظت نہیں کی" ۔

"وہ کیسے؟" میں نے پُوچھا۔

"اگر ہم پِنجرے کو بر آمدے کی بجائے کمرے میں رکھتے تو بِلّی بچّے تک نہیں پہنچتی" ۔

"اب کیا فائدہ اِن باتوں سے" میں نے کہا "مگر آیندہ احتیاط کرنا۔ گھونسلے سے گِرنے والے کسی بچّے کو ہاتھ نہ لگانا ۔ ہو سکتا ہے اُس کی ماں کسی تدبیر سے اُسے واپس گھونسلے میں لے جائے یا اُسے وہیں کسی محفوظ جگہ تک پہنچا دے ۔"

یہ کہ کر میں نے دیوار کی طرف دیکھا جہاں بُلبُل بیٹھی تھی۔ اُداس اور غم زدہ ۔ وہ بار بار سر گھما گھما کر اُس خالی پنجرے کو دیکھ رہی تھی جس میں کل وہ اپنے بچّے کو زندہ سلامت چھوڑ گئی تھی ۔

میرا دِل تیزی سے دھڑکا اور آنکھیں بھر آئیں۔

کِرن

رابعہ رحمٰن

حیدر صاحب کاروبار کے سلسلے میں انگلینڈ گئے تو وہاں انہیں مسٹر سٹیفن جیسا بہترین دوست مِلا۔ دونوں میں اتنی پکی دوستی ہو گئی کہ مسٹر سٹیفن نے اگلے سال پاکستان آنے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے سال مسٹر سٹیفن جب پاکستان آئے تو اُن کی دس سالہ بیٹی سِلوی بھی اُن کے ہمراہ تھی۔ حیدر صاحب اپنی بیٹی صبا کے ہمراہ مہمانوں کے استقبال کے لئے اسلام آباد ائر پورٹ پر موجود تھے ۔ سٹیفن جب ہوائی جہاز سے اُترے تو حیدر صاحب اُن سے بڑے پُرجوش انداز سے ملے۔ صبا نے بھی سِلوی کو خوش آمدید کہنے کے لئے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

جب سب گھر پہنچے تو کِرن پھولوں کا گلدستہ لئے کھڑی تھی ۔ کِرن نے آگے بڑھ کر سنہری بالوں والی انگریز گڑیا سِلوی کو گلدستہ پیش کرنا چاہا۔ مگر صَبا نے گلدستہ درمیان سے ہی پکڑ لیا اور بولی "تم اِدھر کیا کر رہی ہو کِرن؟ جاؤ جا کر کام کرو۔" کِرن کی خوبصورت آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ سِلوی نے پوچھا "صبا کیا یہ بھی ہماری دوست ہے؟" صبا نے نخوت سے جواب دیا "نہیں۔ یہ تو ہمارے گھر میں کام کرنے والی لڑکی ہے۔"

کِرن نے یہ سنا اور اندر بھاگ گئی۔

سِلوی نے صبا کے ہاتھ سے وہ گُلدستہ لے لیا اور دونوں باتیں کرتی ہوئی ڈرائینگ روم میں آگئیں جہاں حیدر صاحب اور مسٹر سٹیفن خوش گپیوں میں مصروف تھے ۔ اتنے میں ایک عورت ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر داخل ہُوئی اور چائے بنانے لگی۔ "سِلوی، یہ کِرن کی ماں ہے" صبا نے بتایا۔ کِرن کی ماں نے چائے بنا کر سب کو پیش کی۔

چائے پینے کے سِلوی اور صَبا نے کپڑے بدلے اور باغ میں آگئیں۔ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کھیل رہی تھیں کہ سِلوی کی نظر درخت کے پیچھے کھڑی ہوئی کِرن پر پڑی۔ سِلوی نے صبا کا ہاتھ چھوڑا اور کِرن کی طرف بڑھ کر کہا "آؤ کرن ہمارے ساتھ کھیلو۔"

"نہیں، نہیں۔ میں نہیں کھیلوں گی ۔ صبا بی بی مُجھے ماریں گی" کِرن نے ڈر کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

سِلوی نے کِرن کا بڑھ کر ہاتھ تھام لیا اور کہا "نہیں کِرن صبا تو اتنی اچھی لڑکی ہے وہ بھلا تمہیں کیوں مارے گی؟"

اِتنے میں صبا بھی قریب آگئی اور بولی "کیا بات ہے سِلوی؟"

"کچھ نہیں صبا ۔ میں کِرن سے کہہ رہی تھی کہ ہمارے ساتھ کھیلو مگر وہ تم سے بہُت ڈرتی ہے۔"

"اس نے ضرور تم سے میری شکایت کی ہو گی" صبا ایک دم غُصّے سے بولی اور کِرن نے کو دھکّا دینا چاہا۔ جب صبا کِرن کو دھکّا دینے لگی تو سِلوی اچانک درمیان میں آگئی۔ سِلوی کو اِتنی زور سے دھکّا لگا کہ وہ پھولوں کی کیاری میں جا گرِی۔ کِرن نے جلدی سے سِلوی کو اُٹھایا ۔ اُس کے بازوؤں پر کچھ خراشیں آگئی تھیں۔

صبا اندر گئی تو حیدر صاحب سامنے ہی کھڑے تھے "ابُو! کِرن نے سِلوی کو پُھولوں کی کیاری میں گِرا دیا ہے۔" صبا نے ان سے شکایت کی۔ حیدر صاحب جلدی سے سِلوی کے پاس گئے اور اُس کے بازؤوں کی خراشیں ڈیٹول سے صاف کیں اور دوائی لگا دی۔ پھر وہ صَبا سے کہنے لگے "بیٹی، میں جانتا ہوں کِرن بہت سمجھدار لڑکی ہے۔ اُس نے سِلوی کو جان بوجھ کر نہیں گِرایا ہو گا۔" باپ کو کِرن کی حمایت کرتے دیکھ کر صبا

رونے والی ہو گئی اور کمرے میں چلی گئی۔ حیدر صاحب نے سلوی کو کہا مجھے بہت افسوس ہے بیٹی کہ آپ کو تکلیف اُٹھانا پڑی۔

کوئی بات نہیں انکل۔ بچّوں کو تو چوٹیں لگتی ہی رہتی ہیں۔ اور ویسے بھی مجھے کرن نے نہیں گرایا۔ صَبا کرن کو دھکّا دینے کے لئے آگے بڑھی تو میں درمیان میں آگئی اور گر گئی"۔ سلوی نے تمام بات بتا دی۔

حیدر صاحب بولے "بیٹی، صبا کی یہی باتیں مُجھے پریشان کرتی ہیں۔ پتا نہیں وہ کرن کو کیوں بُرا سمجھتی ہے؟"

سلوی حیدر انکل کو خُدا حافظ کہہ کر صبا کے کمرے میں چلی گئی۔ صبا اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ سلوی نے خاموشی سے بتّی بُجھا دی اور آرام سے سو گئی۔

صُبح ناشتے پر کرن اپنی امّی کے ساتھ میز پر چیزیں رکھ رہی تھی کہ سلوی حیدر صاحب سے کہنے لگی "انکل آج ہم لوگ سیر کرنے جائیں گے اور کرن بھی ہمارے ساتھ جائے گی"۔

"ہاں، ہاں بیٹی! ضرور" حیدر صاحب نے جواب دیا "میں دفتر سے گاڑی بھجوا دوں گا۔ تم کرن کی امّی کو ساتھ لے کر چلی جانا"۔

"شکریہ، انکل" سلوی نے کہا۔

"نہیں ابّو۔ ہم کرن کو ساتھ لے کر نہیں جائیں گے" صَبا نے کہا۔ "کرن تمہارے ساتھ سیر کرنے تھوڑی جا رہی ہے۔ وہ تو سامان وغیرہ کا دھیان رکھنے کے لئے جا رہی ہے"۔ حیدر صاحب نے صبا کو منانے کے لئے کہا۔ صبا نے اچھا ابو کہا اور کمرے میں تیار ہونے کے لئے چلی گئی۔

سلوی کمرے میں جانے کی بجائے باورچی خانے میں چلی گئی جہاں کرن چہرا ہتھیلیوں پر رکھے کچھ سوچ رہی تھی۔

"آنٹی، آپ کرن کو تیار کر دیں۔ ہم سب سیر کرنے جائیں گے" سلوی نے کرن کی امّی سے کہا۔

"نہیں۔میں نہیں جاؤں گی" کرن نے کہا۔ سلوی نے وجہ پوچھی، تو کرن نے کہا"میں اِس لئے نہیں جاؤں گی کیونکہ صبا بی بی مجھے پسند نہیں کرتیں"۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

کرن کی امّی نے سلوی سے کہا"بیٹی، تم جاؤ۔ میں اِسے تیار کرتی ہوں"۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سب تیار ہو کر ٹیکسلا روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر صَبا اور سلوی سیر کرنے لگیں تو سلوی نے کرن کو ساتھ لے لیا۔ کرن نے دو تین دفعہ صَبا اور سلوی کی گفتگو میں شامِل ہونے کی کوشش کی لیکن صبا ہر دفعہ اس کو جھاڑ پلا کر خاموش دیتی۔ سیر کرنے کے بعد جب تینوں واپس آئیں تو کرن کی ماں گھاس کے ایک سر سبز لان میں کھانا لگا چکی تھی۔

"صبا بی بی، کھانا لے آؤں؟" کرن کی ماں نے پوچھا۔

"ہاں، لے آؤ بھوک لگ رہی ہے"۔ صَبا نے کہا۔

صبا اور سلوی کھانا کھانے لگیں تو سلوی نے کرن سے کہا" آؤ، کرن، تم بھی ہمارے ساتھ کھانا کھا لو"۔

"بیٹی! آپ کھائیں، یہ بعد میں کھا لے گی" کرن کی ماں نے کہا۔

"نہیں آنٹی۔ کرن ہمارے ساتھ ہی کھائے گی" سلوی

نے اصرار کیا ۔ کِرن ایک طرف چادر پر بیٹھ گئی۔ صبا نے مُنہ بسورتے ہوئے کھانا شروع کیا تو کِرن بولی "بسم اللہ تو پڑھ لو، صبا"۔ صبا یہ سُن کر لال پیلی ہو گئی ۔ اُس نے نوالہ کِرن کے مُنہ پر دے مارا اور بولی "تم سمجھتی ہو کہ میں نے بسم اللہ نہیں پڑھی ۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"صبا بی بی کِرن نے آپ سے کوئی غلط بات تو نہیں کہی" کِرن کی ماں نے کہا ۔ یہ سُن کر صبا کو اور بھی غصہ آگیا۔ وہ غصے سے پیچھے کو مُڑی تو اُس کا پاؤں ایک گڑھے میں پڑا اور دُہرا ہو گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گر پڑی ۔ کِرن کی ماں نے اُس کو اُٹھایا ۔ اُس کے پاؤں میں موچ آگئی تھی ۔

جب گھر پہنچے تو درد کی وجہ سے صبا کو بُخار ہو گیا۔ کِرن صبا کے بُخار سے بہت پریشان تھی۔ وہ آدھی رات تک صبا کے کمرے میں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی رہی ۔ اُس کو نیند نہیں آ رہی تھی ۔ در اصل اُسے موٹی آنکھوں والی صبا بہت اچھی لگتی تھی ۔ مگر وہ صبا کے جتنا قریب رہنے کی کوشش کرتی، وہ اُتنا ہی اُس سے دور رہتی۔

کِرن آدھی رات کو کمبل اوڑھ کر قالین پر بیٹھ گئی اور اللہ میاں سے دُعا کرنے لگی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے ۔ کچھ دیر بعد صبا کا حلق خُشک ہوا تو اُس نے آنکھیں کھول دیں ۔ کِرن اب بھی رو رہی تھی۔ اُس کا معصوم چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چُکا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے نِکلنے والی سِسکیاں اور دعائیں صبا نے بھی سُن لیں مگر آنکھیں بند کیے لیٹی رہی ۔

جب کچھ دِنوں بعد صبا تندرست ہو گئی تو سِلوی کے ابُو نے بتایا کہ ہم پرسوں جا رہے ہیں۔ یہ سُن کر صبا اور سِلوی دونوں پریشان ہو گئیں ۔ اگلی صُبح سِلوی نے صبا سے کہا "اگر میں تمہاری دوست ہونے کے ناتے تم سے ایک بات کہوں تو بُرا تو نہیں مانو گی ؟"

صبا نے مُسکرا کر کہا "نہیں۔ بالکل نہیں"۔

"دیکھو، صبا میں چلی جاؤں گی تو تم اکیلی رہ جاؤ گی۔ میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ کِرن کو اپنی دوست بنا لو۔ دیکھو، اللہ تعالی نے سب کو برابر بنایا ہے۔ اگر کِرن غریب ہے تو اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دوستی کے قابل نہیں۔ وہ تو بہت پیاری لڑکی ہے ۔ تم سے بہُت پیار کرتی ہے ۔ تم نے دیکھا نہیں کہ تمہاری بیماری میں بیچاری کس طرح ساری رات جاگتی رہی؟"

سِلوی کی یہ بات سُن کر صبا کو کِرن کی آدھی رات والی سِسکیاں یاد آگئیں اور اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے ۔ اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "مگر میں اُس سے کیسے کہوں کہ وہ میری دوست بنے؟ مجھے معافی مانگتے ہوئے شرم آتی ہے"۔

"تو کیا تم کِرن کو اپنی دوست بنانے کے لیے تیار ہو؟" سِلوی نے خوشی سے کہا۔ "دوست نہیں بلکہ بہن" صبا نے کہا "اُس رات جب میں بیمار تھی تو کِرن روتے ہوئے اللہ تعالی سے میری صحت کی دُعا کر رہی تھی ۔ اُس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ مجھے کِرن کو بُرا نہیں سمجھنا چاہیے ۔"

"تو اب تمہارا کیا خیال ہے؟" سِلوی نے پوچھا۔

"میں اُسے دوست بنانا چاہتی ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟" صبا نے جواب دیا۔

سِلوی نے صبا کو ایک ترکیب بتائی ۔ اُس نے کہا کہ تم صُبح تین گلدستے بنانا اور جب ہم واپس جانے لگیں تو ایک میرے ابّو کو دینا، دوسرا مجھے اور تیسرا کِرن کو دے دینا ۔ کِرن سمجھ جائے گی اور بہت خوش ہو گی۔

صبا نے صبح صبح تین گلدستے بنائے۔ جب سِلوی اور اس کے ابُو کار میں بیٹھ کر ائر پورٹ جانے لگے تو صبا نے ایک گلدستہ انکل سٹیفن کو دیا اور دوسرا اپنی دوست سِلوی کو دے دیا ۔ کِرن کچھ دور پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔صبا نے کِرن کو آواز دی تو وہ ڈرتے ڈرتے اُس کے قریب آگئی ۔ صبا نے تیسرا گلدستہ کِرن کی طرف بڑھا دیا۔

"کِرن آج سے تم میری دوست ہی نہیں، بہن بھی ہو" صبا نے کہا ۔

کِرن کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں ۔ اُس نے وہ گلدستہ صبا کے ہاتھ سے پکڑ کر شکریہ ادا کیا۔

صبا میں اِس تبدیلی کی وجہ سے سب بہت خوش ہوئے اور سب نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ سٹیفن اور سِلوی جب روانہ ہوئے تو صبا کے ہاتھ کے ساتھ کِرن کا گلدستے والا ہاتھ بھی لہرا رہا تھا۔

میں اور میری چھوٹی بہن مینا ہر مہینے کے پہلے جُمعے کو چڑیا گھر جاتے تھے ۔ چڑیا گھر ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ جانے سے پہلے امّی ہمیشہ مجھے تاکید کرتیں:

"جمّی بیٹے ، مینا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھنا ۔ جب سُرخ بتّی جل جائے اور گاڑیاں رُک جائیں تب سڑک پار کرنا۔ سڑک پار کرتے وقت دائیں بائیں ضرور دیکھنا ۔ پیسے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھنا اور کسی اجنبی آدمی سے بات مت کرنا۔"

چڑیا گھر میں داخل ہو کر ہم سب سے پہلے طوطوں کے پنجروں کے پاس جاتے ۔ مینا کو بجری گر طوطے بہت پسند تھے ۔ وہ دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہتی اور پھر بڑی حسرت سے کہتی "جمّی بھائی جان ، چڑیا گھر والوں سے کہہ کر ایک طوطا مجھے دِلوا دو ۔ ابُّو تو پتا نہیں کب لائیں گے۔"

اور سچّی بات تو یہ ہے کہ چھوٹی نسل کے یہ خوب صورت طوطے مجھے بھی بہت اچھے لگتے تھے ۔ جب ہم گھر واپس آتے تو تقریباً ہر دفعہ ابُّو سے طوطوں کی فرمائش کرتے اور وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے "اچھّا بیٹے، اس مہینے ٹھہر جاؤ ۔ اگلے مہینے ضرور لا دیں گے۔"

لیکن وہ اگلا مہینا ابھی تک نہیں آیا تھا ۔

ایک دن ہم چڑیا گھر گئے تو وہاں کچھ زیادہ ہی چہل پہل تھی ۔ سارا چڑیا گھر رنگ برنگ جھنڈیوں اور غباروں سے سجا ہوا تھا ۔ معلوم ہوا کہ آج بچّوں کا میلا ہے ۔ جب ہم ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر پہنچے تو بُکنگ کلرک نے کہا "ٹکٹ کا آدھا حصّہ سنبھال کر رکھنا ۔ چار بجے لاٹری پڑے گی اور پانچ بچّوں کو بجری گر طوطوں کا ایک ایک جوڑا دیا جائے گا۔"

چُوں کہ میں بڑا تھا اس لیے ٹکٹ میں ہی خریدتا تھا۔ میں نے ٹکٹ لیے ، گیٹ کیپر سے اُن کے آدھے حصّے لے کر جیب میں رکھے اور ہم دونوں اندر چلے گئے ۔ آج ہمارا کسی چیز میں دِل نہیں لگ رہا تھا۔ دونوں کی یہی خواہش تھی کہ جلدی سے چار بجیں اور لاٹری پڑے ۔ مینا بار بار کپکپاتی ہوئی آواز میں کہتی "اللہ میاں! میرا نمبر نکل آئے" میں اسے چپ رہنے کے لیے کہتا لیکن اندر سے میرا بھی یہی حال تھا۔ میں بھی ، دل ہی دل میں یہی دُعا مانگ رہا تھا۔

آخر خُدا خُدا کر کے چار بجے ۔ چڑیا گھر کا ایک آدمی ایک اُونچے سے ٹیلے پر چڑھ گیا اور مائکروفون پر چیخ کر بولا "سب بچّے اس ٹیلے کے سامنے جمع ہو جائیں ۔ قُرعہ اندازی ہو گی ۔ پانچ نمبر نکالے جائیں

گے ۔ جن بچّوں کے نمبر نکلیں گے انہیں بجری گر طوطوں کا ایک ایک جوڑا دیا جائے گا۔" پھر اس نے کسی سے کہا "یہ ڈبا یہاں لاؤ۔"

ایک آدمی گتّے کا ایک بڑا سا ڈبا اٹھا کر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اس ڈبّے میں ٹکٹوں کے وہ آدھے حصّے تھے جو گیٹ کیپر نے پھاڑ کر ڈبّے میں ڈالے تھے ۔ اس کے بعد تین آدمی بجری گر طوطوں کے پانچ پنجرے لے کر آئے ۔ تمام بچّوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں ۔

مینا میرا ہاتھ دبا کر بولی "میں وہ سا پنجرا لوں گی ۔ اس میں بہت خوب صورت طوطے ہیں۔"

"زیادہ خوش مت ہو" میں نے آہستہ سے کہا "سینکڑوں بچے ہیں کیا پتا کس کا نمبر نکلتا ہے۔"

"خاموش! خاموش! اس آدمی نے چِلّا کر کہا "مہربانی کر کے خاموش ہو جائیے ۔ اور اب ایک بچّہ میرے پاس اوپر آجائے۔"

بہت سے بچّے ، ایک دوسرے کو دھکّے دیتے ہوئے ، ٹیلے کی طرف بڑھے ۔ ہم ہجوم کے بیچ میں کھڑے تھے ۔ دھکّے کھا کر پیچھے چلے گئے ۔ اس آدمی نے گھبرا کر کہا "صرف ایک بچّہ چاہیئے ۔ باقی تمام بچّے اپنی اپنی جگہ خاموشی سے کھڑے رہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ، اور پھر ایک دبلی پتلی ، سنہرے بالوں والی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولا "آپ آجائیے۔"

لڑکی دوڑتی ہوئی اوپر چڑھ گئی ۔ تمام بچّوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں ۔ اس آدمی نے لڑکی کی آنکھوں پر رومال باندھا اور اس کا ایک ہاتھ ٹکٹوں کے ڈبّے میں ڈال دیا ۔ پھر اس نے مائکروفون پر کہا "یہ لڑکی پہلا لکی نمبر نکالے گی ۔ آپ سب اپنے اپنے نمبر دیکھئے۔"

مینا نے مجھ سے پوچھا "ہمارے ٹکٹ کہاں ہیں"؟

"میری جیب میں" میں نے جواب دیا۔

"میرا کون سا ہے"؟ اس نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا" میں نے کہا "میں نے تو دونوں ٹکٹ جیب میں رکھ لیے تھے ۔ دونوں گڈمڈ ہوگئے ہیں۔"

"اوہ"! اس نے کہا "اب یہ کیسے معلوم ہو گا کہ میرا کون سا ہے اور تمہارا کون سا"!

"لو" میں نے جیب میں سے ٹکٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے "تم دونوں لے لو۔"

سنہرے بالوں والی لڑکی کا ہاتھ تیزی سے ڈبّے میں گھوم رہا تھا ۔

چند سیکنڈ بعد اس نے ایک ٹکٹ نکالا ۔ اس آدمی نے ٹکٹ کا نمبر دیکھا اور پھر بولا "خاموش! خاموش! میں نمبر بولتا ہوں ۔ اپنے نمبر غور سے دیکھیے ۔ جس بچّے کا یہ نمبر ہو وہ اوپر آجائے ۔ غور سے سُنیے: پانچ ، تین ، چار ، آٹھ ۔ میں پھر بولتا ہوں: فائیو ، تھری ، فور ، ایٹ ۔"

ہجوم میں سے ایک لڑکا چلّایا "یہ میرا ہے! یہ میرا ہے"! وہ بچّوں کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا ٹیلے پر چڑھا اور ٹکٹ اس آدمی کو دے دیا۔ وہ نمبر دیکھ کر بولا "مبارک! مبارک! تالیاں"! بچّوں نے تالیاں بجائیں اور لڑکا پنجرا اُٹھا کر نیچے اُتر گیا ۔

لڑکی نے دوبارہ ڈبّے میں ہاتھ ڈالا اور ایک ٹکٹ نکال کر اس آدمی کو دے دیا۔ یہ ایک چھوٹی سی لڑکی کا نمبر تھا۔ وہ خوشی سے اُچھلتی ہوئی آئی اور پنجرا لے کر چلی گئی۔ اس کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا نمبر نکالا گیا۔ ہر نمبر پر تالیاں بجتیں اور جیتنے والا بچّہ پنجرا لے کر چلا جاتا۔

"اب صرف ایک پنجرا رہ گیا ہے" مینا گھٹی ہوئی آواز میں بولی "اور یہ طوطے وہی ہیں جنہیں میں نے پسند کیا تھا"۔

"میں نے بھی انہیں ہی پسند کیا تھا"۔ میں نے مُٹھیاں بھینچ کر کہا۔

"خاموش! خاموش!" اس آدمی نے زور سے کہا "اب آخری نمبر سُنیے: چھ، سات، دو، نو۔ میں پھر بولتا ہوں: سِکس، سیون، ٹُو، نائن۔"

"یہ میرا ہے! یہ میرا ہے!" مینا اُچھل کر بولی۔ لیکن اس کی آواز بچّوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔

"تم کیسے کہتی ہو یہ تمہارا ہے؟" میں بولا "میرا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"بے ایمانی مت کرو" اس نے غُصّے سے کہا "تم نے مجھے دونوں ٹکٹ دے دیے تھے۔ اب یہ میرا ہے"۔

"چھ، سات، دو، نو۔ جس بچّے کا یہ نمبر ہو وہ اُوپر آ جائے۔" اس آدمی کی آواز آئی۔

"بے ایمانی تو تم کر رہی ہو" میں نے بھی غصّے سے کہا "کیا اس پر تمہارا نام لکھا ہے؟"

"کیا چھ، سات، دو، نو نمبر کا بچّہ یہاں نہیں ہے؟" اس آدمی نے پوچھا۔

"لکھا ہو یا نہ لکھا ہو۔ یہ نمبر میرا ہے اور طوطے میں لوں گی" مینا بولی۔

"اگر اس نمبر کا بچّہ یہاں موجود نہیں ہے تو ہم دوسرا نمبر نکالیں گے" اس آدمی نے چیخ کر کہا اور لڑکی کا ہاتھ ڈبّے میں ڈال دیا۔

"ٹھہریے! ٹھہریے!" میں پوری طاقت سے چلّایا لیکن بچّوں کے شور میں میری آواز اس آدمی تک نہ پہنچ سکی۔

میں نے مینا کا وہ ہاتھ پکڑا جس میں ٹکٹ تھا اور بولا "ٹکٹ مجھے دے دو"۔ لیکن اس نے ٹکٹ کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ اب ہم نے بچّوں کے ہجوم میں سے گزر کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن کسی نے ہمیں راستہ نہ دیا۔

اتنے میں اس آدمی کی آواز آئی "خاموش ہو جائیے اور غور سے سُنیے۔ آخری نمبر ہے۔۔۔۔ لیکن یہ گڑبڑ کیسی ہے؟ یہ دونوں کیوں لڑ رہے ہیں؟"

"چھ سات، دو، نو میرا نمبر ہے" میں نے حلق پھاڑ کر کہا۔

"یہ میرا نمبر ہے" مینا نے بھی چلّا کر کہا۔

وہ آدمی خود نیچے اُتر کر ہمارے پاس آیا اور بھیڑ کو ایک طرف ہٹاتا ہوا ہمیں اوپر لے گیا۔ لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ٹکٹ مینا کی مُٹھی میں تھا اور اُس کی مُٹھی میری مُٹھی میں تھی۔

اُس آدمی نے قہقہہ لگایا اور بولا "کمال ہے! ایک ٹکٹ کے دو مالک! ارے بھئی، یہ ٹکٹ تم میں سے کس کا ہے؟"

مینا نے سر اُٹھا کر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جنہیں میں کبھی نہ بُھول سکوں گا۔

میں نے دانتوں تلے ہونٹ دبایا اور پھر بولا "یہ ٹکٹ میری بہن کا ہے۔"

مینا کا چہرہ گلاب کی طرح کِھل اُٹھا۔ وہ آدمی طوطوں کا پنجرا اُسے دے کر بولا "مبارک! مبارک! تالیاں۔"

مینا نے پہلے اُس آدمی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی "شکریہ" پھر طوطوں کو دیکھا، اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی "جمی بھائی، یہ میرے نہیں ہیں۔ صرف میرے نہیں ہیں۔ یہ ہمارے ہیں۔ ہم دونوں کے۔"

(مارٹیا۔سی۔شمیچر کی کہانی "ایڈی اینڈ آئی" سے ماخوذ)

وہ رات

مسعود اشعر

یہ واقعہ 1948 کا ہے، جب کشمیر میں آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ایک طرف کشمیر کے نہتے عوام، اپنے پٹھان بھائیوں کی مدد سے، آزادی حاصل کرنے کے لیے جدّوجہد کر رہے تھے، اور دُوسری طرف ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے لیس ڈوگرا اور بھارتی فوجیں اُن کے خون سے ہولی کھیل رہی تھیں۔ کتنے ہی کھیت، کھلیان، شہر اور قصبے ویران ہو گئے تھے۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہُوا تھا۔ کوئی گاؤں، کوئی بستی دُشمنوں کی لُوٹ مار اور قتل و غارت سے نہیں بچی تھی۔

محمُود ایک ایسے علاقے میں رہتا تھا جس پر ڈوگرا فوج کا قبضہ تھا۔ کوئی شخص گھر سے باہر نکلنے کی جُرأت نہ کرتا تھا، کیونکہ ڈوگرا سپاہی کشمیری مُسلمان کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے تھے۔ لیکن اُس رات محمُود کی خالہ بہت بیمار تھیں۔ وہ اُس کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر رہتی تھیں اور محمُود کی ماں کے لیے وہاں جانا بہت ضروری تھا۔ گھر اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا، اِس لیے محمُود کی ماں اُسے گھر میں چھوڑ کر چلی گئیں اور تاکید کر گئیں کہ دروازہ اچھّی طرح بند کر لینا، اور جب تک میں نہ آؤں، ہرگز نہ کھولنا۔ محمُود نے دروازہ اندر سے بند کیا اور سو گیا۔

آدھی رات کے قریب گولیاں چلنے کی آواز آئی تو اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور اُس کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس کے جی میں آئی کہ کھڑکی کھول کر باہر جھانکے کہ کسی نے دروازے پر زور سے دستک دی اور ساتھ ہی ایک کرخت آواز آئی:

"دروازہ کھولو! جلدی کرو! ورنہ ہم توڑ دیں گے۔"

محمُود کے حلق میں جیسے کوئی چیز اٹک گئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ ڈوگرا سپاہی ہیں۔ اُس نے سوچا کہ وہ تھک کر خود ہی چلے جائیں گے، لیکن اُنھوں نے دروازے پر رائفلوں کے بٹ اتنی زور زور سے مارنا شرُوع کیے کہ سارا مکان لرزنے لگا۔ آخر وہ تھر تھر کانپتا ہُوا اُٹھا اور دروازے کے پاس جا کر پُوچھا "کون ہے"؟

ایک سپاہی نے کڑک کر کہا "دروازہ کھولو!"

محمُود نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور ایک طرف سہم کر کھڑا ہو گیا۔

"یہاں کون رہتا ہے"؟ ایک سپاہی نے پُوچھا۔

"میں اور میری ماں" محمُود نے جواب دیا "وہ خالہ کے گھر گئی ہیں"

"ٹھیک ہے۔ تم لالٹین لے کر آؤ۔ ہم گھر کی تلاشی لیں گے" سپاہی نے بڑے رُعب سے کہا۔

محمُود کوٹھڑی میں جا کر لالٹین جلانے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ گھر کی تلاشی کیوں لے رہے ہیں اور یہ کس کی تلاش میں ہیں!

جب وہ لالٹین لے کر آیا تو اُس نے دیکھا کہ دس بارہ سپاہی اور آ گئے ہیں۔ ایک سپاہی نے اُس کے ہاتھ سے لالٹین لے لی اور کہا "تم یہیں ٹھہرو۔"

محمود دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا اور سپاہیوں نے گھر کا ایک ایک کونا چھاننا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں سب سپاہی واپس آ گئے اور ایک سپاہی نے کہا "وہ یہاں نہیں آیا۔ باہر ہی ہوگا۔ جلدی چلو۔ کہیں بھاگ نہ جائے۔"

سپاہیوں نے گھر کا سارا سامان اُلٹ پُلٹ کر دیا تھا۔ محمود نے سب چیزیں ٹھکانے سے رکھیں اور لالٹین کی بتّی دھیمی کر کے کوٹھڑی میں رکھ دی۔ باہر بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ محمود کو زور کی سردی لگی اور وہ لحاف میں گھُس گیا۔ مگر ابھی ٹھیک طرح لیٹا بھی نہ تھا کہ کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ وہ سمجھا ڈوگرا فوجی واپس آ گئے ہیں۔ لیکن پھر سوچا، ڈوگرے اِس طرح، آہستہ سے دستک نہیں دیتے۔ وہ دروازے کے پاس گیا اور آہستہ سے پُوچھا "کون ہے؟"

"تمھارا ایک بھائی" ہلکی سی آواز آئی "جلدی دروازہ کھولو۔"

محمود نے دروازہ کھولا تو حیرت سے اُس کی چیخ نکل گئی۔ اُس کے سامنے ایک پٹھان کھڑا تھا، جس کے بازُو پر خون میں لتھڑا ہُوا کپڑا بندھا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ شخص ہے جسے ڈوگرا فوجی تلاش کر رہے ہیں۔

پٹھان اندر آگیا اور دروازہ بند کر کے بولا "اُف! کتنی سردی ہے۔"

محمود نے کہا "ارے! آپ تو زخمی ہیں۔"

"ہاں۔ مگر زخم زیادہ گہرا نہیں" پٹھان نے جواب دیا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا "وہ مجھے یہاں تلاش کر رہے تھے، اور میں باہر جھاڑی میں چُھپا بیٹھا تھا۔ تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟"

"نہیں اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہُوں۔ وہ اپنی بہن کے ہاں گئی ہیں" محمود نے جواب دیا۔

"اور تمھارے والد؟" پٹھان نے پُوچھا۔

محمود کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "وہ آزادی کی جنگ میں شہید ہو گئے۔"

پٹھان چارپائی پر بیٹھ گیا اور خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھُورنے لگا۔ محمود نے جھجکتے ہُوئے پُوچھا "یہ آپ کے بازو میں کیا ہوا؟"

"گولی لگی ہے" پٹھان نے جواب دیا، اور پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولا "آہ! اب کیا ہوگا! وہ سب مارے جائیں گے۔"

"کون مارے جائیں گے؟" محمود نے پُوچھا۔

"میرے ساتھی مُجاہد" پٹھان نے کہا "میں اپنے کمانڈر کا پیغام لے کر دوسرے کمانڈر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ڈوگرا سپاہی مل گئے۔ میں نے اُن سے بچنے کے لیے گھوڑا تیز کر دیا۔ انھوں نے گولی چلا دی جو میرے بازُو میں لگی۔ میں گھوڑے سے گر گیا۔ پاس ہی ایک گھنی جھاڑی تھی۔ میں اُس میں چُھپ گیا۔ لیکن میرے گھوڑے کو اُنھوں نے پکڑ لیا۔ وہ سمجھے کہ میں بھاگ گیا ہُوں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہُوا کہ آپ بچ گئے" محمود خوش ہو کر بولا۔

"ہاں میں تو بچ گیا، لیکن گھوڑے کی کاٹھی میں کچھ ضروری کاغذ رکھے تھے۔ اگر وہ اُن کے ہاتھ لگ گئے تو میرے تمام ساتھی مارے جائیں گے۔ کاش! وہ ......"

پٹھان بات پُوری نہیں کر پایا تھا کہ ایک دم چونک کر کھڑا ہو گیا۔ دُور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی۔ ڈوگرے واپس آ رہے تھے!

محمود نے کہا "سپاہی آ رہے ہیں۔ آپ چُھپ جائیں۔ جلدی!"

"مگر کہاں چھپوں؟" پٹھان نے پُوچھا۔

ایک کونے میں لکڑیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ محمود نے تھوڑی سی لکڑیاں ہٹا کر جگہ بنائی اور بولا "یہاں بیٹھ جائیے۔ میں اُوپر سے لکڑیاں رکھ دُوں گا۔"

اُس نے پٹھان کو لکڑیوں میں چُھپا کر دروازے کی کُنڈی کھول دی اور بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈوگرے دروازہ کھول کر اندر آئے اور ایک ڈوگرا گرج کر بولا "وہ پٹھان کہاں ہے؟ جلدی بتاؤ ورنہ جان کی خیر نہیں۔"

محمود کے حلق میں آواز اٹک گئی۔ اُس نے بولنے کی بہُت کوشش کی لیکن آواز نے ساتھ نہ دیا۔ ایک سپاہی کڑک کر بولا "اِس علاقے میں یہی چار پانچ مکان ہیں۔ ہم نے دوسرے مکانوں کی تلاشی لے لی ہے۔ وہ ضرور تمہارے مکان میں چھپا ہُوا ہے۔ آخر جا کہاں سکتا ہے؟"

اِس سے پہلے کہ محمود کوئی جواب دیتا، ایک سپاہی نے اُس کو چارپائی سے گھسیٹ کر زمین پر پٹک دیا اور پھر تمام سپاہی اِدھر اُدھر پٹھان کو تلاش کرنے لگے۔

محمود نے اِسی میں خیریت سمجھی کہ وہاں سے کِھسک جائے۔ وہ چُپکے سے اُٹھا اور سپاہیوں کی آنکھ بچا کر باہر نکل گیا۔ دروازے کے پاس ایک درخت سے، چھ سات گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔

محمود غور سے گھوڑوں کو دیکھنے لگا۔ یکایک اُس کی نظر سیاہ رنگ کے ایک گھوڑے پر پڑی جو دوسرے گھوڑوں سے زیادہ تھکا ہُوا نظر آتا تھا۔ اُس کی کاٹھی بھی باقی گھوڑوں سے الگ تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ گھوڑا اُسی پٹھان کا ہے!

وہ جلدی سے گھوڑے کے پاس پہنچا اور اُس کی کاٹھی میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ اچانک اُس کے دِل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کاٹھی میں چند کاغذ ٹُھنسے ہُوئے تھے!

اُسی وقت سپاہیوں کے واپس آنے کی آواز آئی۔ وہ گھر کی تلاشی لے چُکے تھے۔ محمود نے جلدی سے کاٹھی کے اندر سے کاغذ نکالے اور قریب ہی ایک جھاڑی میں چُھپ گیا۔

جب ڈوگرے چلے گئے تو وہ جھاڑی میں سے نکلا اور گھر جا کر جلدی جلدی لکڑیاں ہٹائیں۔ اجنبی پٹھان بالکل صحیح سلامت تھا۔ اُس نے جلدی سے پُوچھا "وہ لوگ چلے گئے؟"

"چلے گئے ..... اور یہ دیکھیے!" محمود نے پٹھان کے ہاتھ میں کاغذ تھما کر کہا۔

"ارے! یہ تو وُہی کاغذ ہیں" پٹھان مُجاہد چیخ کر بولا "یہ تمھیں کہاں سے ملے؟"

محمود نے سارا قصّہ سُنایا تو پٹھان خوشی سے ناچنے لگا اور محمود کو گلے لگا کر بولا "بیٹا، اِن کاغذوں میں جنگی نقشے ہیں۔ اگر یہ دُشمن کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ ہمارے تمام مورچوں اور جنگی چالوں سے واقف ہو جاتا ــــ بہادُر قوم کے بہادُر سپُوت! تم نے یہ بہُت بڑا کارنامہ کیا ہے، اور اس کے صِلے میں تمھیں بہُت بڑا اِنعام ملے گا۔ خُدا حافظ، بہادُر لڑکے۔ تم میرا اِنتظار کرنا۔ میں بہُت جلد واپس آؤں گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے کاغذ اپنی جیب میں رکھے اور رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

انصاف

مقبول انور داؤدی

خلیفہ ہارون رشید عباسی خاندان میں ایک عظیم شہنشاہ ہوا ہے۔ امین اور مامون اُس کے دو بیٹے تھے۔ ہارون رشید کا انتقال طوس میں ہوا اور وہ وہیں دفن ہوا۔ دونوں بھائیوں میں تخت کے لیے لڑائی ہوئی جس میں مامون کامیاب ہوا اور اُس نے بڑے اطمینان و سکون سے حکومت کی۔

مامون خود صاحبِ علم تھا، اس لیے اہلِ علم کا قدر دان تھا۔ اُس نے بغداد میں ایک بیتُ الحکمت قائم کیا جہاں دُوسری زبانوں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ مامون نے ہندوستان سے بھی سنسکرت کی کتابیں منگوا کر اُن کے عربی میں ترجمے کرائے۔

مامون اگرچہ ایک عظیم حکمران تھا لیکن اُس کے مزاج میں بڑا انکسار تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کسی کے گناہوں کو معاف کر دینے سے مجھے ایک خاص قسم کی لذت اور مسرت ملتی ہے۔ اگر لوگوں کو میری اس خوبی کا علم ہو جائے تو وہ میرے پاس اپنے گناہوں کے تحفے لایا کریں۔

مامون کا ایک بیٹا عباس اپنے باپ کے بالکل اُلٹ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ تمام دُنیا ہماری غلام ہے اور ہم اُن کے آقا ہیں۔ وہ سیر و شکار کا بھی بڑا شوقین تھا۔ ایک دن وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار سے واپس آ رہا تھا۔ شام کا جھٹ پٹا تھا۔ وہ بغداد کی بیرونی بستی کے قریب پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ ایک بہت خوب صورت عورت کنوئیں سے پانی نکال رہی ہے۔ عباس کچھ دیر تو اُس خاتون کو ہکا بکا کھڑا تکتا رہا۔ پھر گھوڑے کو آگے بڑھایا اور پوچھا "اے خاتون، تُو کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟"

شہزادے کی گفتگو سُن کر عورت کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے بڑی نفرت اور حقارت سے شہزادے کی طرف دیکھا اور پانی کا گھڑا بغل میں دبا کر جلد جلد قدم اُٹھاتی اپنے گھر کو چل دی۔ شہزادہ عباس نے عورت کے اس رویّے کو اپنی توہین خیال کیا اور فیصلہ کیا کہ اِس مغرور عورت کے ساتھ شادی کر کے اِس کے غرور کو خاک میں ملا دینا چاہیے۔ اُس نے اپنے ایک خاص خادم کو حکم دیا کہ وہ فوراً اس عورت کا حسب نسب معلوم کرے اور اُس کی طرف سے اُسے شادی کا پیغام دے۔

اگلی صبح خادم نے حاضرِ خدمت ہو کر بتایا کہ حضور یہ عورت خاندانِ برامکہ سے ہے اور اس کا نام مُغیرہ ہے۔ یہ ایک بیوہ عورت ہے۔ اِس کے خاوند کا نام حُسین بن موسیٰ تھا اور یہ دو بچّوں کی ماں بھی ہے۔ خادم نے شہزادے کو یہ بھی بتایا کہ جب اُس نے خاتون کو حضور کی طرف سے شادی کا پیغام دیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی اور انتہائی غصّے سے کہا کہ ہارون ہماری جانیں لے چکا ہے اور اب مامون ہماری عزّت کے درپے ہے۔ اُس نے چلّا کر کہا "جاؤ! عبّاس سے جا کر کہ دو کہ اگر اُس نے اِس سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اُس کی ساری شاہ زادگی اِس جھونپڑی کی چوکھٹ پر مسل کر رکھ دی جائے گی۔"

خادِم کی یہ بات سُن کر عبّاس غُصّے میں کانپنے لگا۔ اُس نے کہا "تم جاؤ۔ ہم دیکھ لیں گے برامکہ کی اِس عورت کو۔"

اگلے روز مُغیرہ صُبح کی نماز پڑھ کر فارِغ ہی ہُوئی تھی کہ ایک سپاہی شہزادے کا یہ حُکم لے کر آیا کہ تمھارا یہ مکان بحقِ سرکار ضبط کر لیا گیا ہے۔ دو گھنٹے کے اندر اندر مکان خالی کر دو، ورنہ تمھارے گھر کا سامان باہر پھینک دیا جائے گا۔"

مُغیرہ سفید چادر سر پر ڈال کر اور اپنے دونوں بچّوں کو ساتھ لے کر گھر سے نکلی اور سیدھی خلیفہ مامُون رشید کے دربار میں پہنچی۔ عبّاس بھی اُس وقت مامُون کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ مُغیرہ نے کہا "امیرُالمؤمنین! ایک بیوہ اپنی عزّت کی حفاظت کے لیے اپنے مکان میں بیٹھی تھی۔ اب یہ مکان آلِ عبّاس کو مُبارک ہو۔ لیکن مامُون! کان کھول کر سُن لو۔ ایک دِن تمھیں بھی اُس شہنشاہ کے سامنے پیش ہونا ہے جس کی سلطنت کبھی فنا ہونے والی نہیں۔ وہاں میری فریاد سُنی جائے گی اور تمھیں اِس کا جواب دینا پڑے گا۔ اے خلیفہ! میں تیرے پاس ایک ظالم کی فریاد لے کر آئی ہُوں۔ اِس کا اِنصاف تو یہاں کرے گا یا قیامت کو اِس کا حساب دے گا؟"

خلیفہ نے پُوچھا "وہ کون ظالم ہے جس نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے؟"

عورت نے چیختے ہوئے کہا "تیرا بیٹا عبّاس، جو تیرے پہلُو میں بیٹھا ہے۔"

یہ سُنتے ہی مامُون کا چہرہ لال ہو گیا۔ اُس نے عبّاس کو حُکم دیا کہ اُٹھو اور عورت کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور اپنی صفائی پیش کرو۔ مُغیرہ بڑی جُراٴت اور دِلیری سے اپنی شکایت بیان کر رہی تھی۔ اُس کے مقابلے میں جب شہزادے سے کوئی بات پُوچھی جاتی تو اُس کی آواز لڑکھڑانے لگتی، نگاہیں جُھک جاتیں۔

مامُون کو یقین ہو گیا کہ عبّاس قصُوروار ہے۔ اُس نے کہا "عبّاس! اِس خاتُون سے اپنی زیادتی کی معافی مانگو۔ اگر اِس نے معافی نہ دی تو تمھیں جیل جانا ہوگا۔"

عبّاس نے مُغیرہ سے بڑی لجاجت سے معافی مانگی اور مُغیرہ نے اُسے معاف کر دیا۔ خلیفہ نے مُغیرہ کو پانچ سو اشرفیاں دیں اور نہ صِرف اُس کا ضبط شُدہ مکان اُسے مِل گیا بلکہ عبّاس کے لیے جو محل بنوایا گیا تھا، وہ بھی مُغیرہ کے حوالے کر دیا گیا۔

فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

Rs. 115.00